قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

۳۹ انتالیسواں وعظ مسمی بہ

الاسعاد والابعاد

مع

مجلس قند

منجملہ ارشادات حکیم الامت حضرت مرشدی ومولائی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم العالی

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

بابتہ ماہ جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون کے باہتمام سے چھپا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہٖ

الاسعاد فی الابعاد

مع

مجلسِ قباد

تمہید از جامع

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔ ناظرین اس وعظ کا نام دیکھکر غالباً متحیر ہوئے ہونگے کہ وعظ کے نام میں جلسہ کا ذکر کیا اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہید کے طور پر واقعۂ وعظ کو پہلے بیان کردیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ سال رواں میں دو طالب علم مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں فارغ التحصیل ہوئے تھے ایک مولوی محمد قباد (بنگالی) دوسرے مولوی .... کانپوری ماہ شعبان ۴۲ھ میں یہ دونوں صاحب اپنے وطن کو جانیوالے تھے اسلئے اہل مدرسہ نے چاہا کہ ان دونوں کو سند و دستار فضیلت دی جائے پھر بعض اتفاقات کی وجہ سے آخر الذکر رجب ہی میں اپنے وطن چلے گئے صرف اول الذکر طالب علم رہ گئے جب وہ بھی اپنے وطن کو جانے لگے تو ۱۴ شعبان ۱۳۴۲ھ کو بعد نماز جمعہ ایک مختصر سے جلسہ میں اُن کو سند و دستار

دیا جانا تجویز ہوا اور اسکے ساتھ ہی اہل مدرسہ کی یہ بھی خواہش ہوئی کہ حضرت حکیم الامت دام مجدہم اس موقعہ پر اہل علم کو خصوصاً اور حاضرین کو عموماً مناسب نصائح فرما کر اپنے کلمات طیبات سے قلوب کو منور فرمائیں چنانچہ تاریخ مذکور پر بعد نماز جمعہ سب نمازیوں کو اطلاع کر دی گئی کہ اسوقت مدرسہ کا مختصر سا جلسہ ہوگا اور اسکے بعد حضرت مولانا کچھ بیان فرمائینگے جن صاحبوں کا جی چاہے ٹھہر جائیں جب سب لوگ سنت جمعہ سے فراغت پا چکے تو اول مہتمم مدرسہ کی طرف سے ایک مختصر تحریر پڑھکر سنائی گئی (مہتمم مدرسہ اسوقت تھانہ بھون میں موجود نہ تھے اسلئے اس تحریر کو حضرت حکیم الامت دام مجدہم کی اجازت سے جامع وعظ نے پڑھکر سنایا) وھو ھذا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

حامداً ومصلیاً ومسلماً **امابعد** ۔ حاضرین جلسہ کو غالباً یہ بات معلوم ہے کہ مدرسہ امداد العلوم متعلقہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کی اصلی غرض اصلاح اخلاق وتربیت عادات ہے۔ یہاں زیادہ اہتمام اسی کا کیا جاتا ہے کہ طالبین سلوک کو اذکار واشغال کے ساتھ تکمیل معاشرت واخلاق کی تعلیم دیجائے اور اسکے لئے چونکہ مسائل دینیہ کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے بقدر ضرورت تعلیم وتدریس کتب کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے اور چونکہ قرب وجوار میں ماشاء اللہ بڑے بڑے مدارس دینیہ موجود ہیں اسلئے یہاں کل درسیات کی تکمیل کا اہتمام نہیں کیا جاتا صرف قدر ضرورت پر اکتفا کیا جاتا ہے چنانچہ اسی لئے اسوقت سے پہلے یہاں کسی کی تکمیل درسی نہیں ہوئی لیکن اگر کوئی طالب علم اتفاقاً یہیں تکمیل کے واسطے قیام کرلے تو اس سے انکار بھی نہیں کیا جاتا چنانچہ اسوقت ایک طالب علم مولوی محمد قبا صاحب بنگالی۔ ایسے موجود ہیں جنھوں نے اکثر حصہ درسیات کا اسی مدرسہ میں پڑھا ہے اور اب بحمد اللہ وہ فارغ التحصیل ہو کر اپنے گھر جانیوالے ہیں۔ انکے اساتذہ ومدرسین نے چاہا کہ جانے سے پہلے اُن کو سند فراغ دیدیں تاکہ ایک یادگار اپنے شفیق معلموں کی اُن کے پاس رہے جس سے انشاء اللہ برکت کی بھی امید ہے۔ نیز یہ بھی چاہا

کہ طریقۂ معمولہ (اکابر) کے موافق انکو دستار فضیلت بھی دیجائے جس سے مقصود محض ان کی تطییب قلب ہے اور کسی درجہ میں طلبہ حاضرین کو ترغیب تکمیل بھی۔ ان کا مقتدا ظاہر کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس مختصر جلسہ سے شہرت ہی کیا ہو سکتی ہے جو اس کا وہم کیا جائے۔ نہ اس سے مدرسہ کی کارگذاری کا اظہار مقصود ہے کیونکہ اس مدرسہ کی جیسی خاموش زندگی بسر ہو رہی ہے وہ سبکو معلوم ہے کہ نہ یہاں چندہ ماہواری و سالانہ کا انتظام ہے نہ کسی ہی مدرسہ کیلئے کسی قسم کی تحریک امداد کیجاتی ہے (بلکہ اگر کوئی مخلص از خود دوسروں کو تحریک کرنا چاہے تو اس سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اظہار کارگذاری کا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان امور کی ضرورت ان مدارس کو ہے جنمیں چندہ کی تحریک ہوتی ہے اور یہاں یہ سلسلہ ہی نہیں بلکہ اس مدرسہ کا) محض توکل پر گذارہ ہے اور الحمد للہ کہ حق تعالیٰ من حیث لا یحتسب اس کا ہر کام چلا رہے ہیں۔ پس اسوقت اس جلسہ سے مقصود ایک تو ان فارغ شدہ طالب علم کی تطییب قلب ہے دوسرے یہ کہ سب حضرات ان کیلئے دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان کو اپنے علم سے منتفع فرمائیں اور استقامت علی الشریعت کی دولت سے مالامال فرمائیں آمین والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

احقر

شبیر علی مہتمم مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون

۱۴ شعبان ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ

اس تقریر مختصر کے بعد احقر جامع وعظ نے اپنی ایک نظم عربی پڑھکر سنائی جو خاص اس جلسہ کیلئے تو نہیں بنائی گئی تھی بلکہ ایک دوسرے موقعہ کیلئے لکھی گئی تھی مگر اسوقت اسمیں کچھ ترمیم و تغیر کر کے اس جلسہ کے مناسب کر دیا گیا تھا جسکے سنانے سے محض اپنے احباب حاضرین کو محظوظ و مسرور کرنا مقصد تھا اور اپنے مشائخ کے کمالات و احسانات کا اظہار اور ان کی دعاؤں کا لینا اور حمد و نعت نبوی سے وسیلۂ نجات طلب کرنا و بس

(وھو ھذا)

یا قلب مالک طائراً مسرور — مالی اری لک کمیت منشور

اے دل تو خوشی سے کیوں اڑا جا رہا ہے — میں تجھے مردنی کے بعد دوبارہ زندہ کیوں دیکھتا ہوں

مابالُ وجهك مشرقاً متهللا
تیرا چہرہ روشن چمکدار کیوں ہے؟
ام هل مررت على منازلها التي
یا تو اس کی ان منازل پر گذرا ہے جو
ام هل وصلت الى سرادق عزها
یا کیا تجھے اسکے سراپردۂ عزت تک وصول میسر ہو گیا؟
او مر طيف خيالها بك موهنا
یا آدھی رات تجھے اسکے خیال کی جھلک گذر گئی؟
حورية رمت الرقاب بلحظها
وہ ایسی حور صفت ہے جو اپنے تیر نگاہ سے گردنوں کو اڑاتی
ما للظلام تبدلت بالنور
یہ اندھیریوں کو کیا ہوا جو روشنی سے بدل گئیں یعنی
دع عنك ذكر سعاد والزمن الذي
بس تم سعاد کا اور اس زمانہ کا ذکر جانے دو
انی طلعت على معالم طيبة
میں نے تو مدینۂ طیبہ (علی صاحبہا الف الف صلوۃ وتحیۃ)
لما وصلت الى رياض مجدد
(کب؟) جبکہ میں مجدد ملت
اشرف علی المقتدی بفعاله
جنکا اسم گرامی (مولانا محمد) اشرف علی (صاحب دام مجدہم) ہے
زاكى النجار فلا يزن بريبة
پاکیزہ سرشت ہیں اسلئے کسی کھوٹ کیساتھ متہم نہیں ہو سکتے
بحر الندى علم الهدى بطل الوغى
سخاوت کے سمندر ہدایت کا پہاڑ اور رزم کے بہادر ہیں

ارأيت وجه سعاد بعد دهور
کیا تو نے زمانہ ہائے دراز کے بعد (محبوبہ) سعاد کا منہ دیکھ لیا ہے
شاقتك من بين الدنى والدور
تیرے دلکو تمام گھروں اور مکانوں کے درمیان سے کشش کرتی ہیں
او شممت برق جمالها المستور
یا تو نے اسکے جمالِ مستور کی بجلی کی چمک دیکھ لی
ام ارسلت من عندها ببشير
یا اس نے تیرے پاس اپنی طرف سے کوئی خوشخبری دینے والا قاصد بھیجدیا
سبت القلوب بشعرها المضفور
اور گندھی ہوی بالوں سے دلوں کو اسیر کرتی ہے
ما للزمان اتى بكل حبور
زمانہ کو کیا ہوا جو ہر خوشی کو ساتھ لے آیا
منی مضی فی حب ذات خدور
جو پردہ نشینوں کی محبت میں مجھے گذرا ہے
وشممت ريح جنابها المعطير
کے نشانات پر اطلاع پائی ہے اور اس بارگاہ معطر کی خوشبو سونگھی ہے
وحكيم امة احمد المنصور
و حکیم امت احمد منصور صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ (یعنی خانقاہ) میں پہونچا
غوث الانام بكل يوم شرور
جن کے افعال کی اقتدا کیجاتی ہے ہر ہلاکت کے وقت میں وہ مخلوق کے
نال العلى بجهاده المبرور
اپنی مقبول کوششوں سے انہونے بلند مرتبہ حاصل کیا ہے
يمحو الضلال بسيف المشهور
(المسلول ۱۲ منہ)
گمراہی کو اپنی شمشیر برہنہ سے مٹاتے رہتے ہیں

مبعوث رب العلمین مجدد
رب العلمین نے اُن کو پیدا کیا ہی ہدایت کے راستونکی

سبل الرشاد بسعیه المشکور
تجدید کیلئے اپنی مقبول کوشش کے ذریعہ سے

وبماجاءه کرامة من عنده
اور اُس (دولت) کے ذریعہ سے جو بطور کرامت کے حق تعالیٰ نے

تاج الولایة والتقی والنور
بدل من ما فی ماجاءه ۱۲ منہ
اپنے پاس سے انکو عطا کی ہے (وہ کیا؟) ولایت وتقویٰ اور نور کا تاج

وبآیة ظهرت لارباب الحجی
اور اُس کرامت کے ذریعہ جو عقلاء پر ظاہر ہوچکی ہے

فی رأیه والنطق والتحریر
اُن کی رائے میں اور تقریر وتحریر میں۔

جلیت وجوه مطاوعیه منیرة
اس کرامت نے اُن کے موافق طبقہ کو چہرے روشن کر دیے

وطلت وجوه معاندیه بقیر
اور مخالف جماعت کے چہروں پر تارکول ملدیا

اکرم به من عارف متفرد
کیا ہی بزرگ عارف ہیں جو مخلوق کے درمیان

بین الانام کنسمة فی الصور
(جمع صورة ۱۲ منہ)
ایسے متفرد ہیں جیسے اجسام میں روح

ابدی سرائرکان اخفاها الاوا......ئل فی الطریق باحسن التصویر
انھوں نے وہ اسرار باحسن وجوہ ظاہر کر دیے جنکو متقدمین نے طریق میں مخفی رکھا تھا

قد اسمعت کلماته صم الهوی
اُنکے کلمات نے ہوائے (نفسانی) کے بہروں کو شنوا کر دیا

وبوجهه انفتحت عیون العور
اور اُن کے چہرہ سے اندھوں کی آنکھیں کھل گئیں

فتلألأت انوار سنة احمد
پس سنت احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار اُن سے روشن ہوگئے

منه نعم واشعة التفسیر
ہاں اور تفسیر کی شعاعیں بھی چمکنے لگیں۔

روّی الانام بفیضه واظلهم
مخلوق کو اپنے فیض سے سیراب کر دیا اور اسپر

من نوره ظل بغیر حرور
اُن کے نور کا سایہ پرتو افگن ہوگیا جسمیں گرمی کا نام نہیں

ع۱ اشارة الی حدیث ان اللہ یبعث لهذه الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لها دینها رواه ابوداود فی الملاحم من سننه ۱۲ منه

ع۲ قلت اما اصابة رأیه فی الامور فقد جربته العامة والخاصة فی عصر الغوغاء المرتفعة المعنونة بحمایة الخلافة ومخالفة الحکومة والاتحاد مع الهنود فکان الشیخ اطال اللہ بقاءه یراها وخیمة العواقب عظیمة المصائب فی حق مسلمی الهند وکان یشیر خاصته بعدم الدخول فیها فلم یمض الامدة یسیرة وقد رأی الناس کلهم بالعیان ماکان رأها قبل بنور الجنان واما آیة نطقه فلا تحتاج الی البیان فهو الفرد المطلق فی هذا المیدان لم یسبقه احد فی الوعظ والتقریر فی هذا الزمان وکذا التحریر فری تصانیفه منتشرة فی الآفاق منتشرة فی الاقطار تلقتها الامة بالقبول ووقع من ردها فی حضیض الخمول و ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ۱۲ منه

طوبیٰ فقد فتح البشیر عیوننا ... بقمیص یوسف فائحاً بعبیر

خوشخبری ہو کہ بشیر نے پیراہن یوسفی کے ذریعہ سے ... ہماری آنکھیں کھولدیں جو کہ خوشبو سے مہک رہا ہے

منه الحیوة لکل حق میّتٍ ... منه الممات لکل قولٍ زورٖ

اُن کی وجہ سے ہر سچی مردہ بات کو حیات ملگئی ... اور ہر جھوٹی بات کو موت نصیب ہوئی

منه البیاض لکل قلبٍ اسودٍ ... منه السواد لکل عین ضریرٖ

اُن سے ہر سیاہ دل کو سفیدی حاصل ہوگئی ... اور ہر اندھی (سفید) آنکھ کو سیاہی

لازال فی کنف الاله ولم یزل ... عون الخلائق جابر المکسورٖ

وہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کے دامن (حفظ) میں رہیں اور ہمیشہ ... مخلوق کے مددگار بنے رہیں درشکستگی کو جوڑتے رہیں آمین

والحمد لله العظیم فانه ... بیدٍ به کل زمة التقدیرٖ

اور تمام حمد خدای برتر و بزرگ کیلئے ہے کہ اُسی کے ... ہاتھ میں تقدیر کی تمام باگیں ہیں

ماشاء کان ولم یکن مالم یشأ ... ملک الملوک وفوق کل قدیرٖ

جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نچاہے نہیں ہوسکتا ... بادشاہوں کا بادشاہ اور ہر زبردست سے بڑھا ہوا ہے

وهو المراد لکل قلبٍ عاشقٍ ... وهو الانیس لمبتلی محصورٖ

وہی ہر دلِ عاشق کی مراد ہے ... اور وہی ہر مبتلائے محصور کا انیس ہے

وهو الرحیم علی العباد بلطفه ... وهو الملاذ المرتجی لامورٖ

وہی اپنے بندوں پر لطف کیساتھ مہربان ہے ... اور وہی سبکی پناہ ہے جسکی سب کاموں میں امید کیجاتی ہے

وهو الغفور لکل عبدٍ مذنبٍ ... وهو العلیم بکل ذات صدورٖ

وہی ہر بندۂ گنہگار کی مغفرت کرنیوالا ہے ... اور وہی دل کی سب باتوں کو جاننے والا ہے

سبحان رب العرش رب محمد ... محیی العظام بنفخة فی الصور

پاک ہے عرش کا پروردگار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا ... جو ہڈیوں کو صُور کی ایک پھونک سے زندہ کرنیوالا ہے

ثم الصلوٰة مع السلام علی الذی ... هو روح کل صغیرنا وکبیرٖ

پھر درود مع سلام کے نازل ہو اُس ذات (ستودہ صفات) پر ... جو ہمارے ہر چھوٹے بڑے کی جاں ہیں

ختم الرسالة لامثال لوجهه ... کلا ولن یأتوا له بنظیرٖ

رسالت (کے سلسلہ) کو ختم کرنیوالی ہیں جنکی ذات کی مثال نہیں ... اور یقیناً لوگ اُن کی نظیر ہرگز نہیں لاسکتے

خطاب العبد الناظم بحضرة الرسالة

محبوب رب العالمين صفيه — وشفيع كل مدنس بفجور

رب العلمین کے محبوب اور برگزیدہ ہیں — اور ہر مبتلائے معصیت کی شفاعت کرنیوالے ہیں

ما خاب قط مؤمل بنواله — يعطي الجزيل يغيث كل مجور

کوئی امیدوارِ عطا اُن سے ناکام نہیں لوٹا — وہ بہت دیتے ہیں اور ہر مظلوم کی فریاد رسی کرتے ہیں۔ (مظلوم ۱۲ منہ)

روحي وما بيدي فداه فانه — خير الخلائق مركز التدوير

میری جان و مال اُن پر فدا ہو کہ وہی — بہترین خلائق ہیں اور تدویر (عالم) کے مرکز ہیں

احبيب انك لو رأيت بنظرة — حالي رثيت لها وكنت عذيري

اے میرے حبیب اگر آپ ایک نظر میرا حال دیکھ لیتے — تو آپ کو رحم آتا اور مجھے آپ معذور سمجھتے

مولاي انك لو مننت بجلوة — لشفيت قلبي من جوى مستور

میرے آقا! اگر آپ ایکبار اپنی تجلی سے مجھ پر احسان فرماتے — تو میرے دل کو سوزشِ پنہاں سے شفا ہو جاتی

وصعقت من رؤيا جمالك بغتة — صعق الكليم اوان دك الطور

اور میں دفعۃً آپکا جمال (جہاں آرا) دیکھکر ایسا بیہوش ہوتا — جیسے حضرت کلیم (علیہ السلام) کوہِ طور کے شکستہ ہونیکے وقت بیہوش ہو گئے تھے

ما كان ضرك لو مننت فربما — من الكريم على فتى مهجور

اور آپکا ہمیں ضرر ہی کیا ہوتا اگر آپ احسان فرمادیں — کیونکہ کریم اپنے مہجور غلام پر بسا اوقات کرم کیا کرتے ہیں

فارحم رعاك الله عثرة جاهل — بعظيم حقك بالهوى مغرور

خدا آپکو سلامت رکھے بس اُس شخص کی لغزش پر رحم فرمائیے — جو آپ کے حقوقِ عظیمہ سے ناواقف اور محبت سے دھوکا کھائے ہوئے ہے

واعف الذي قد كان منه وكيف لا — تعفو وانت رجاء كل حسير

اور جو کچھ اُس سے ہو چکا ہے اسکو معاف فرمائیے — اور آپ کیونکر معاف فرمائیں گے حالانکہ آپ ہر ماندہ کی امیدگاہ ہیں

قد جئت عندك سيدي متوسلا — بجميل عفوك والرجاء ظهيري

میرے آقا! میں آپ کے پاس آپ ہی کے عفوِ جمیل کو — وسیلہ بنا کر لایا ہوں اور امید میری پشت پناہ ہے

صلى عليك الله يا زين الورى — روح الوجود وعون كل اسير

اے مخلوق کی زینت وجود (عالم) کی روح — اور ہر قیدی کے مددگار خداتعالیٰ آپ پر صلوٰۃ وسلام نازل کرے

وعلى صحابتك الكرام اولي النهى — والآل ذي الانوار والتنوير

اور آپ کے صحابہ پر بھی جو اہل فہم وعقل ہیں — اور آل پر بھی جو خود بھی صاحب انوار ہیں اور دوسروں کو بھی منور کرنیوالے ہیں

ما غاب نجم في السماء وما بدا — بدر يزيل حنادس الديجور

جب تک آسمان میں کوئی ستارہ غائب ہوتا ہے — اور چاند شب تاریک کی ظلمتوں کو دور کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے

اسکے بعد احقر ناظم نے وہ سند جو مولوی محمد قباد صاحب کیلئے لکھی گئی تھی حضرت حکیم الامت کے سامنے پیش کی کہ حضرت اپنے ہاتھ سے مولوی قباد صاحب کو عطا فرمادیں چنانچہ حضرت نے اپنے ہاتھ سے اُن کو سند دی اور اسکے بعد اپنے دست مبارک سے اُن کے سر پر دستار فضیلت باندھی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ ہمنے مولوی قباد سے کہا تھا کہ بھائی اگر تم عمدہ عمامہ بندھوانا چاہو تو اپنے پاس سے خرید کر لے آؤ کیونکہ مدرسہ کی طرف سے قیمتی عمامہ نہیں مل سکتا اور اگر مدرسہ ہی سے لینا چاہو تو معمولی ملے گا۔ انھوں نے یہ کہا کہ مجھے معمولی ہی منظور ہے مگر مدرسہ سے عطا فرمایا جائے کہ یہ میرے لئے زیادہ باعث خوشی ہوگا چنانچہ یہ عمامہ اُن کو مدرسہ ہی کی طرف سے دیا جاتا ہے جو بحمداللہ اگر بہت بڑھیا نہیں تو گھٹیا بھی نہیں بلکہ اوسط درجہ کا ہے اور ایک بات کی اور اطلاع کرتا ہوں کہ یہ عمامہ مدرسہ کی عام رقم سے نہیں خریدا گیا بلکہ ایک صاحب نے خاص اسی غرض کیلئے ایک رقم دی تھی اُس سے خریدا گیا ہے اور یہ بات میں مولوی قباد کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ اگر کسی وقت میں وہ کسی مدرسہ کا انتظام کریں تو ان باتوں کا خیال رکھیں کہ ایسے کاموں میں مدرسہ کی عام رقم نہ صرف کیا کریں بلکہ ان کیلئے خاص طور پر چندہ کرلیا جائے جسکے دینے والوں کو صاف طور پر معلوم ہو جائے کہ ہماری رقم اس کام میں لگے گی آجکل عموماً اہل مدارس ان باتوں کا خیال نہیں کرتے وہ عام چندوں کی رقم کو ایسے کاموں میں لگا دیتے ہیں جنمیں صرف ہونیکا چندہ دینے والونکو گمان بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً جلسہ کے انتظام اور مہمانان جلسہ کے طعام وغیرہ میں مدرسہ کی رقم لگا دیتے ہیں حالانکہ چندہ دینے والے اکثر اس نیت سے دیتے ہیں کہ ہماری رقم تعلیم میں صرف کیجائیگی یا اس سے طلبہ کی امداد کیجائیگی اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے جلسہ کے مہمانوں کی دعوت کیجائے گی جنمیں غریب و امیر سب قسم کے ہوتے ہیں تو شاید بہت سے لوگ اس کام کیلئے چندہ نہ دیتے اسلئے ایسے کاموں کیلئے خاص چندہ الگ ہونا چاہئے عام رقوم کو ان میں نہ لگانا چاہئے اس کے بعد حضرت ممبر پر تشریف لیگئے اور ایک بجکر تیس منٹ پر بیان شروع ہوا۔

وعظ

این	کہاں ہوا۔	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔
متی	کب ہوا۔	۱۴ شعبان ۱۳۴۲ھ بعد نماز جمعہ (شروع ایک بجکر ۳۰ منٹ پر ہوا)۔
کم	کتنی دیر ہوا	تین گھنٹہ (۴ ½ پر ختم ہوا)
کیف	کیونکر ہوا۔	بیٹھکر۔
لِمَ	کیوں ہوا	مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں ایک طالب علم فارغ شدہ کی دستار بندی تھی اسلئے حضرت نے طلبہ و علماء کو مناسب وقت نصائح سے سرفراز فرمایا نیز ایک وارد جدید بھی اسکی طرف داعی ہوا جو اسی عرصہ میں حضرت مولانا کے قلب مبارک پر فائض ہوا تھا
ماذا	کیا مضمون تھا	ہر کام میں اس بات کو سوچنا چاہئے کہ یہ آخرت کیلئے مفید ہے یا مضر بعد میں مختصراً جلسہ کے متعلق بھی کچھ بیان تھا
من استمع	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً سالکین و علماء کو۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ و وفقہ لما یرضی۔
المستمعون	سامعین کی تعداد	۷۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	اہل جلسہ پر بیان کا خاص اثر تھا۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ۔ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ و بارک وسلم۔

امابعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ و ان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ج ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ ط ذلکم وصٰکم بہ لعلکم تتقون ○ یہ ایک آیت ہے سورہ انعام کی اخیر کے قریب کی اس کا مضمون ایسا عام اور کلی ہے کہ اسکی تفصیل اگر ساری عمر کی جاوے اور وہ عمر بھی ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک جماعت متعاقبہ کی عمر جو خود فی نفسہ متناہی ہو لیکن بمعنی لاتقف عند حد غیر متناہی ہو اور اس کا ہر فرد اسکی تفصیل بیان کرنا شروع کرے پھر جہاں سے ایک نے چھوڑا ہو اس سے آگے دوسرا بیان کرے اسی طرح سب افراد بیان کرتے چلے جائیں جب بھی اسکی تفصیل ختم نہیں ہو سکتی

کوئی حالت اور کوئی جزئی حادثہ اس آیت سے خارج نہیں بلکہ یہ سبکو مشتمل ہے اور حوادث کا احاطہ سے باہر ہونا ظاہر ہے اس مضمون کے اختیار کرنیکی ضرورت ایک تو یہی ہے کہ مضمون عام ہے۔ اور عام مضمون کا ضروری ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سبکی ضرورت کا ہوا کرتا ہے تمام مخاطب اُسمیں بدرجۂ مساوی شریک ہوتے ہیں مگر عام ضرورت کے علاوہ ایک خاص سبب بھی اسکے اختیار کرنے کا ہے جسکو تحدث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کیونکہ نعمت کا چھپانا ناشکری ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے واما بنعمۃ ربک فحدث۔ دوسرے وہ نعمت سب کے نفع کی ہے تو اسکا چھپانا بیمروتی بھی ہے اسی لیے مثل مشہور ہے کہ حلوا بتنہا نباید خورد۔ اس بنا پر جی چاہا کہ اس نعمت سے اپنے دوستوں کو بھی خبر کر دی جائے تاکہ وہ بھی اس علم عظیم سے نفع حاصل کریں مگر جسطرح اظہار نعمت میں یہ مصلحت ہے اسی طرح اسمیں کید نفس کا مفسدہ بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ ہم نعمت الٰہی کو تحدث بالنعمۃ سمجھکر اس خیال سے بیان کرتے ہیں کہ اظہار نعمت کا نص میں امر ہے مگر اسمیں نفس کا کید بھی مخفی ہوتا ہے کہ اس طریقے سے وہ اپنا کمال ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اظہارِ نعمت سے عجب وکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اس طریق باطن میں اشتباہ اور تلبیس بیحد ہے اخلاق حمیدہ اور اخلاق رذیلہ دونوں دوش بدوش چلتے ہیں ظاہر میں تحدث بالنعمۃ اور دعویٰ کی صورت یکساں ہوتی ہے (تواضع وناشکری میں خلط ہے تادیب وتعنیف میں اشتباہ ہے۔ سیاست اور تحکم کی صورت یکساں ہوتی ہے لطافت اس تن آرائی میں خلط ہے انتظام اور بخل کی صورت یکساں ہے غیرت غضب ایک صورت سے ظاہر ہوتے ہیں استغنا اور تکبر میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا وغیرہ وغیرہ ۱۲ جامع) اسی لئے بعض دفعہ سالک پریشان ہو کر کہتا ہے ؎

صد ہزاراں دام ودانہ است اے خدا ۔۔۔ ما چو مرغان حریص بے نوا

دمبدم پابستہ دام نو ایم ۔۔۔ گر ہمہ شہباز وسیمرغے شویم

میرہانی ہر دمے مارا و باز ۔۔۔ سوے دامے میرویم اے بی نیاز

مگر یہ نہیں ہے کہ واقع میں بھی فرق نہیں یا ایسا دقیق فرق ہے جسکو غور سے بھی نہ سمجھ سکے بلکہ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے مگر اس فرق کے ادراک کیلئے اہتمام وفکر کی ضرورت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں ہمعناں درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

بحرِ تلخ سے اخلاق رذیلہ مراد ہیں اور بحرِ شیریں سے اخلاق حمیدہ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں ایک فاصل قوی ایسا موجود ہے جسکی وجہ سے ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں مختلط ہوسکے جیسے کلکتہ وغیرہ میں سنا ہے کہ بحرِ تلخ و بحرِ شیریں کا اجتماع ہوا ہے اور میلوں تک دونوں میں اختلاط نہیں ہوا ایک طرف شیریں پانی ہے دوسری طرف شور ایک سے کھانا پک سکتا ہے اور دوسرے سے کسی کی دال نہیں گلتی ایسے ہی یہاں اخلاق حمیدہ و رذیلہ میں گو بظاہر اختلاط ہے مگر واقع میں ہر ایک جدا ہے دونوں میں قوی فاصل موجود ہے جو حقیقی اختلاط سے مانع ہے مگر بعض اوقات صاحب معاملہ کو اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اسکے لئے بصر شیخ کی ضرورت ہے پس مولانا کا پہلا ارشاد یعنی ؎ صد ہزاران دام و دانہ است الخ صاحب واقعہ کے اعتبار سے ہے اور یہ ارشاد یعنی ؎ درمیاں شاں برزخ لایبغیاں۔ واقع کے اعتبار سے ہے خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاق حمیدہ و رذیلہ میں واقع میں تو فرق ہے اور ایسا قوی فرق ہے کہ واقعیت کے لحاظ سے دونوں میں خلط کی گنجائش نہیں مگر صاحب واقعہ کو بعض دفعہ اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اسلئے اس طریق میں خلط و اشتباہ بہت واقع ہو جاتا ہے اور صاحب واقعہ کو بھی یہ اشتباہ قلت اہتمام کی وجہ سے ہوتا ہے اور اہتمام و فکر کے بعد اسکو بھی اشتباہ نہیں ہوتا کیونکہ اہتمام پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے رہبری کا چنانچہ ارشاد ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ مجاہدہ کی حقیقت اہتمام ہی ہے جسپر حق تعالیٰ خود رہبری کا وعدہ فرما رہے ہیں تو اب اُن کی دستگیری کے بعد کون چیز مانع ہوسکتی ہے کوئی نہیں پس یہ مسئلہ تو مسلّم ہے کہ اہتمام و مجاہدہ کے بعد خلط نہیں ہوسکتا مگر ہم میں تو اہتمام ہی کی کمی ہے اسی لئے ہمکو اخلاق رذیلہ و حمیدہ میں خلط ہو جاتا ہے۔ ہمارا التحدث بالنعمۃ ریاء و عجب سے مخلوط ہماری تواضع ناشکری سے مشتبہ ہمارا استغناء و توکل تکبر سے ملتبس ہے اسلئے میں حق تعالیٰ سے مدد لیکر اس نعمت کو بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ خلط سے محفوظ رکھے اور اگر خلط ہو جائے تو حق تعالیٰ معاف فرمائیں کیونکہ ہم بہ نسبت حفاظت کے معافی و مغفرت کے محتاج زیادہ ہیں کیونکہ حفاظت کے اہل وہ حضرات ہیں جو گناہوں سے

معصوم ہیں اور ہم گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں اسلئے مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں دوسرے طلب مغفرت میں اپنا ایک عجز ونیاز وضعف ظاہر ہوتا ہے جو طلب حفاظت میں حاصل نہیں ہے اور بندہ سے عجز ونیاز ہی مطلوب ہے اسلئے ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے کو گنہگار سمجھکر مغفرت طلب کرتے رہیں۔ اسوقت مجھے یاد آگیا قصہ حضرت ابراہیم بن ادہم کا کہ ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی اللھم اعصمنی (کہ اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) ارشاد ہوا کہ اگر سب یہی دعا کرنے لگیں تو رحمت ومغفرت کا ظہور کہاں ہوگا اللھم اغفرلی کیوں نہیں کہتے اھ اسمیں بتلادیا گیا کہ جسطرح حفاظت مطلوب ہے مغفرت بھی مطلوب ہے یہی مطلب ہے اس حدیث کا لولم تذنبوا لجاء اللہ بقوم یذنبون فیستغفرون اللہ فیغفرلھم (ترجمہ۔ اگر تم گناہ نکرو تو حق تعالیٰ ایسی جماعت کو پیدا کرینگے جو گناہ کریں پھر استغفار کریں اور ان کی مغفرت کیجائے ۱۲) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ ہمسے مقصود ہے اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم گناہ کیا کریں بلکہ گناہ سے جو ضعف وعجز ظاہر ہوتا ہے وہ مقصود ہے اپس اگر کہیں بدون صدور گناہ ہی کے یہ ضعف وعجز پیدا ہو جائے جیسے انبیاء علیہ السلام واولیاء کاملین میں تو ان کو گناہوں میں مبتلا کرنیکی ضرورت نہیں رہتی چنانچہ واقعی انبیاء علیہم السلام باوجود عصمت کے جسقدر اپنے کو گنہگار خطاوار سمجھتے ہیں ہم گنہگار ہوکر بھی اپنے کو اتنا گنہگار نہیں سمجھتے اور جسقدر وہ حق تعالیٰ سے خوف وخشیت رکھتے ہیں ہم مجرم ہوکر بھی اتنا تو کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی خوف نہیں رکھتے تو اگر ہم لوگ گناہوں میں مبتلا نہ کئے جاتے تو معلوم ہماری کیا حالت ہوتی جب ہم گنہگار ہوکر بھی اپنے کو کچھ بہت زیادہ گنہگار نہیں سمجھتے تو معصوم ہوکر معلوم ہم اپنے کو کیسا کچھ مقدس سمجھتے اور ہمارے عجب کی کیا حالت ہوتی ۱۲) اسلئے کبھی کبھی ہمکو گناہ میں مبتلا کردیا جاتا ہے عہ جس سے ہمارا وہ عجب توڑ دیا جاتا ہے جو طاعات واذکار سے

عہ قلت ویؤیدہ حدیث اخرجہ البیہقی فی الشعب (وقد التزم ان لا یخرج موضوعاً) عن انس رضی اللہ عنہ لو لم تکونوا تذنبون لخفت و فی روایة لخشیت علیکم ما ہو اکبر من ذلک العجب العجب اھ کذا فی العزیزی قال المناوی وذلک ان المعجب بعملہ مغرور راض عن نفسہ فیہلک من حیث لایشعر والعاصی معترف بالتقصیر فرجی لہ التوبة والخیر ولا ینبغی الوقوع فی الذنوب اتکالا علی ذلک بل المطلوب التباعد جدا فلو فرض انہ وقع فلا باس بل یتوب فیحصل لہ الغفران اھ مع تقدیم وتاخیر (ص ۲۰۴ ج ۳) (جامع)

کبھی پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ خیالِ تقدس پارہ پارہ ہوجاتا ہے جو کچھ دنوں تہجد اور مراقبات کی پابندی سے دلپر گذرنے لگتا ہے تو جیسے ہمکو حفاظت حق کی ضرورت ہے اسی طرح مغفرت کی بھی ضرورت ہے اسی لئے حضرت ابراہیم بن ادہم کو تنبیہ کیگئی کہ محض عصمت کی دعا کیوں کرتے ہو اسکی ساتھ دعائے مغفرت کیوں نہیں ملاتے اسکے علاوہ اللہم اعصمنی کے ساتھ اللہم اغفرلی ملانے میں ایک اور بھی حکمت ہے جسپر نظر کرکے اس کا ملانا بہت ہی ضروری ہوگیا وہ یہ کہ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ مجیب الدعوات ہیں چنانچہ جو لوگ دعا قبول ہونے کے شاکی بھی ہوتے ہیں وہ یہ تو کہا کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی مگر یہ کسی کو کہتے ہوئے نہیں سنا گیا کہ دعا قبول ہونیکا وعدہ کہاں ہے بلکہ اس کا سبکو اعتقاد ہے کہ دعا قبول کرنیکا وعدہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا انکار کیونکر ہوسکتا جبکہ قرآن میں صریح ارشاد موجود ہے ادعونی استجب لکم (تم مجھسے دعا کرو میں تمھاری اجابت کرونگا) رہا یہ اشکال کہ جب اجابت دعا کا صریح وعدہ ہے تو پھر اسمیں تخلف کیوں ہوتا ہے اسکے جواب بہت سے ہیں مگر انکی گنجائش کہاں سہل بات وہ ہے جسکو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں پھر کبھی تو جلدی وہی مطلوب عطا فرما دیتے ہیں جو مانگا گیا ہے اور کبھی دیر سے عطا فرماتے ہیں کہ اسمیں مصلحت ہوتی ہے اور اگر اس مطلوب کا دنیا میں دینا مصلحت نہیں ہوتا تو اسکو آخرت کیلئے ذخیرہ کے طور پر جمع رکھتے ہیں جب بندہ قیامت میں حاضر ہوگا سب دعاؤں کا ثواب اسکے سامنے کردیا جائیگا بہر حال اجابت دعا امر ضروری ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اسکی ساتھ ایک دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ دعا کیوقت اس اعتقاد کا بھی حکم ہے کہ میری یہ دعا ضرور ہی قبول ہوگی حدیث میں ہے ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ اب بتلاؤ کہ اگر اللہم اعصمنی کے ساتھ اللہم اغفرلی نہ بڑہایا جائے تو یہ شخص تو اس دعا کے بعد اپنے تقدس کا معتقد ہوگا کیونکہ وہ کہے گا کہ میں نے اپنے لئے عصمت کی دعا کی اور دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور مجھے اعتقاد اجابت کا امر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں اپنے کو معصوم مقدس نہ سمجھوں حق تعالیٰ نے اس الہام میں اللہم اغفرلی بڑہا کر اس اشکال کو رفع فرما دیا اور بڑا علم عظیم عطا فرمایا کہ تم دعائے عصمت کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کیا کرو جسکا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ اول تو مجھے

گناہوں سے بچائیے اور اگر ابتلا ہی مقدر ہے تو مغفرت فرمائیے اس مجموعہ کے اعتقاد میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اب خیال تقدس کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتا سبحان اللہ ایک لفظ بڑھاکر کتنے بڑے پہاڑ کو گرادیا یہ ہیں وہ الہامات جنکو الہام کہنا چاہئے اور یہ مضمون کچھ اس الہام ہی پر موقوف نہیں الہام کیسا خود نص میں بھی اسکی تعلیم موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں یہ دعا فرمائی ہے اللھم قنی شر نفسی وہیں یہ دعا بھی موجود ہے اللھم اغفرلی ذنبی بلکہ نص میں ایک بات اور زیادہ ہے جسکا اس الہام میں پتہ نہیں وہ یہ کہ آپنے دعائے مغفرت میں یہ قید بھی زیادہ فرمائی ہے ما علمت منہ وما لم اعلم یعنی اے اللہ میرے سب گناہ بخشدے وہ بھی جنکو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جنکو نہیں جانتا اسمیں اُن لوگوں کا دعوے توڑ دیا گیا جو چند موٹے موٹے گناہوں سے محفوظ ہوکر تقدس کے مدعی ہیں اس جملہ نے بتلادیا کہ عدم علم علم عدم کو مستلزم نہیں پس اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تمہارے علم میں تمہارے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تو یہ کیا ضرور ہے کہ واقع میں بھی سرزد نہوا ہو اور اسکی ضرورت تو تنزل کے بعد ہے ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ انسان کو اپنے اندر گناہ نظر نہ آئیں ادنی تامل سے انسان اپنی خطاؤں کو سمجھ سکتا ہے بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ ہاں کوئی آنکھیں ہی بند کرلے تو اس کا علاج نہیں اُسکے لئے بسبیل تنزل وہ جواب ہے جو حدیث کے اس جملہ میں دیا گیا ہے ما علمت منہ وما لم اعلم یعنی تمہارا عدم علم علم عدم کو تو مستلزم نہیں پس یہی سمجھکر اپنے کو گنہگار جانتے رہو کہ شاید مجھسے کوئی ایسا گناہ ہوا ہو جسکی مجھے خبر نہوئی ہو چنانچہ حدیث میں اسکی ایک واضح نظیر بھی مذکور ہے حدیث میں آتا ہے یتکلم احدکم بکلمۃ لا یلقی لھا بالا یحطہ اللہ بھا الی النار سبعین خریفا ویتکلم احدکم بکلمۃ لا یعدھا شیئا یرفع اللہ بھا لہ درجات فی الجنۃ او کما قال بعض تم میں سے ایک بات کہتا ہے جسکی طرف قلب کو التفات بھی نہیں ہوتا مگر حق تعالے اُس ایک بات کی وجہ سے اُسکو جہنم میں بہت دور پھینکدیتے ہیں اور بعض آدمی ایک بات کہتا ہے جسکی کچھ وقعت اُسکے نزدیک نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ اُسکی وجہ سے بہت درجے جنت میں اسکے بلند کردیتے ہیں غور کیجئے دوسرے گناہوں کا یاد نہ رہنا تو شاید محل کلام بھی ہو مگر

زبان کے گناہوں میں ایسا ہو جاتا تو کچھ بھی بعید نہیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ روانی کلام میں بہت سی باتیں بلا قصد و ارادہ کے کہجاتے ہیں جنپر اصلا التفات نہیں ہوتا کہ ان کا اثر کیا ہوا ہوگا تو ذنوب لسان کا ہم کو یاد نہ رہنا کیا بعید ہے۔ کچھ بھی نہیں پس اب کسی کو بھی دعویٰ تقدس کا منہ نہیں رہا ۱۲) یہاں سے اہل علم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ احادیث دعا میں بھی بہت علوم ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم سلوک تو اکثر احادیث دعا ہی میں بھرے ہوئے ہیں مگر ان احادیث کو اہل علم ایسی بے توجہی سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں جسکی کچھ حد نہیں اسلئے ہم لوگ بہت سے علوم سے محروم ہیں۔ الغرض چونکہ دعویٰ کبھی بصورت تحدث بالنعمۃ بھی ہوتا ہے اسلئے میں نے دعائے حفاظت کے ساتھ دعائے مغفرت کو بھی منضم کر لیا کہ اگر خدا نخواستہ مجھسے غلط ہو جائے تو حق تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمائیں اس تمہید کے بعد میں حق تعالیٰ پر توکل کر کے اور انکی امداد طلب کر کے اُس نعمت کو بیان کرتا ہوں۔ وہ نعمت یوں تو نئی نہیں ہے بلکہ پرانی ہے اور ہر مسلمان کو حاصل ہے مگر بعض دفعہ ایک وارد کسی خاص حالت سے آتا ہے تو نیا معلوم ہوا کرتا ہے جیسے آج جمعہ کا دن ہے سب لوگ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو گو اس جدت لباس سے یہ لوگ بدل نہیں گئے بلکہ سب وہی ہیں جو ایک گھنٹہ پہلے تھے مگر پھر بھی ہر شخص میں ایک جدت ضرور معلوم ہوتی ہے اور یوں خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص ہی بدلگیا ہے اور قاعدہ ہے کل جدید لذیذ اسلئے گو وہ نعمت فی نفسہ پرانی ہے مگر اس زمانہ قریب میں وہ جس شدت و حدت کے ساتھ قلب پر وارد ہوئی ہے اس طرح پہلے وارد نہوئی تھی اسلئے وہ مجھے نئی نعمت معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے جو لذت و حظ اور جو اثر میرے قلب پر اسوقت ہے وہ ویسا ہی ہے جو نعمتِ جدیدہ سے ہوا کرتا ہے۔ جمعہ کے دن کپڑے بدلنے سے اشخاص میں جدت معلوم ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہماری یہاں خانقاہ میں ایک صاحب رہتے تھے جو معلّم بھی تھے ایک دن میں نے ایک مہمان کو دکھلا کر ان سے کہا کہ میں ان کا کھانا گھر سے بھیجتا ہوں تم اُن کو کھلا دینا اور بتلا دیا کہ وہ مہمان یہ ہیں ان کو پہچان لو اسوقت وہ مہمان اتفاق سے ایک چادرہ اوڑھے ہوئے تھے میں مکان کو آ گیا کچھ دیر کے بعد اُن صاحب کا کھانا آیا معلم صاحب کھانا لیکر خانقاہ میں ان مہمان کو تلاش کرنے لگے

جب وہ نہ ملے تو میری پاس آئے کہ مہمان تو معلوم کہاں چلے گئے ملتے نہیں حالانکہ اسوقت وہ مہمان میرے پاس بیٹھے تھے میں نے کہا بندۂ خدا یہ تو بیٹھے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں کہ یہ چادرہ تو اوڑھے ہوئے ہیں ہی نہیں۔ (اسوقت مہمان نے گرمی کی وجہ سے چادرہ اتار دیا تھا) میں نے اُن مہمان سے کہا کہ حضرت جب آپ کہیں جایا کریں تو اول سے آخر تک ایک ہی لباس میں ہا کریں یا کم از کم کھانیکے وقت تو وہی لباس پہن لیا کریں جسمیں اول آپ وارد ہوا کریں ورنہ بھوکے مر جاوگے کیونکہ دنیا میں ایسے بھی عقلاء ہیں جنکے نزدیک چادرہ اتار دینے سے آدمی بدل جاتا ہے تو ہمارے اُن دوست نے چادرہ کے نہونے سے مہمان کو نیا آدمی سمجھا اور اس کا یہ خیال گو ہمارے نزدیک حماقت ہو مگر فلاسفہ کی تحقیق پر منطبق ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک اعراض کے بدلنے سے تشخص بدلجاتا ہے اور اعراض میں ایک عرض مقولہ ملک اور ایک عرض مقولہ جدہ بھی ہے جنکے تبدل سے تشخص معروض بدلجاتا ہے خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مقصود میرا یہ ہے کہ جدت حال سے ذوالحال میں بھی گو نہ جدت آجاتی ہے اگو اس درجہ کی جدت نہو جیسی ہمارے اُن دوست نے سمجھی تھی کہ چادرہ اُترنا دینے سے مہمان کے وجود ہی کی نفی کر دی ۱۲) اور قاعدہ ہے کل جدید لذید اسلیئے مجھے اس نعمت سے وہی حظ حاصل ہو رہا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے کل جدید لذید پر مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک لطیفہ مجھے یاد آگیا۔ مولانا کی عادت تھی کہ غریبوں کو تو مہمانی میں پلاؤ قورمے کھلاتے تھے اور امیروں کو دال ساگ مولانا کا مقصود تو اس سے اور ہی کچھ تھا وہ یہ کہ مولانا کی نظر میں اغنیاء کی قدر نہ تھی غریبوں کی قدر تھی اسلیئے غریبوں کی خاطر مدارات امیروں سے زیادہ کرتے تھے اور یہ سنت اللہ ہے حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فقراء مہاجرین کو اغنیاء سے پانچسو برس پہلے جنت میں داخل کرینگے تو خدا کے نزدیک غرباء کی اتنی قدر ہے مگر اب یہ رنگ ہے کہ ایک غریب مجھے کہتے تھے کہ آجکل تو غریبوں کی بہت ہی مٹی پلید ہے ابتو اگر کسی امیر سے ریح صادر ہو جائے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی اور غریب سے صادر ہو جائے تو اُسکو دھمکاتے اور مجلس سے نکالدیتے ہیں کہ کمبخت نے سڑا دیا دماغ پاش پاش کر دیا۔ حالانکہ غریبوں سے امیروں کی ریح زیادہ سڑی ہوتی ہے کیونکہ وہ مرغن غذا اور مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں جس سے معدہ سخت متعفن ہو جاتا ہے غریبوں کے معدے ایسے متعفن نہیں ہوتے کیونکہ اول تو وہ

سادہ غذا کھاتے ہیں پھر وہ بھی معدہ میں باقی نہیں رہتی دو چار دفعہ ہل بانے سے سب ہضم ہو جاتی ہے مگر باایں ہمہ امیروں کی ریح سے کسی کا دماغ نہیں پھٹتا اور غریبوں سے پاش پاش ہو جاتا ہے یہ زمانہ کا اثر ہے کہ آج کل غریبوں کی بیقدری بہت ہے مجھے اس مبارک اور صحت ہونے پر ایک حکایت یاد آئی ایک دفعہ میں ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا وہاں ایک صاحب نے زور سے ریح صادر کی لوگوں کو ناگوار ہوا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

چو باد اندر شکم پیچد فرو هل　　　که باد اندر شکم بار یست بر دل

کہنے لگے دیکھئے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ جب پیٹ میں گڑبڑ ہو تو ہوا چھوڑ دینی چاہیے میں نے اسپر عمل کیا ہے پھر ناگواری کی کیا وجہ۔ میں نے کہا کہ شیخ نے اس شعر میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ زور سے چھوڑا کرو۔ کہنے لگے کہ اس شعر میں گو اظہار و اخفار کی تصریح نہیں مگر جس قصہ میں یہ شعر ہے اسمیں وقوع اعلان ہی کی ساتھ ہوا تھا جبھی تو انکو اس معذرت کی ضرورت ہوئی آہستہ صدور ہوا ہوتا تو اہل مجلس سے عذر خواہی کی انکو کیا ضرورت تھی۔ اسوقت تو مجھے انکی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں ہار گیا اور وہ دونوں راستوں سے جیت گئے اوپر کے راستہ سے بھی اور نیچے کے راستہ سے بھی (اوپر کے راستہ سے حجت و دلیل کے ساتھ جیتے اور نیچے کے راستہ سے تو جیتے ہوئے تھے ہی کہ سب کو بدبو سے دبا دیا ۱۲) بعد میں انکی دلیل کا جواب میری سمجھ میں آیا کہ وہاں تو زور سے اتفاقاً ہوا تھا اور یہاں ان صاحب نے قصداً زور سے کیا تھا یہ فرق ہے اس قصہ میں اور ان کے فعل میں۔ اور واقعی قصداً زور سے ریح صادر کرنا خصوصاً مجمع میں بہت ہی نازیبا حرکت اور آدمیت کے خلاف ہے ہمارے یہاں ایک میانجی تھے جو لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے لڑکے بے تمیز تو ہوتے ہی ہیں وہ مکتب ہی میں ریح صادر کر دیتے میانجی نے کہا کہ یہ بہت نالائق حرکت ہے سارا مکتب اس سے سڑ جاتا ہے اب سے جسکی ریح آوے وہ باہر جاکر چھوڑا کرے پھر یہ فکر ہوئی کہ اسکے لئے کس لفظ سے اجازت لیجائے تو میانجی نے یہ تجویز کیا کہ جب اس کام کیلئے کوئی جایا کرے تو وہ یوں کہا کرے کہ میانجی چڑیا چھوڑ آؤں۔ یہ میانجی بھی ایسی باتوں میں مجتہد ہوتے ہیں کیا لفظ بامعنی نکالا ہے بس اب کیا تھا لڑکوں کے ایک کھیل ہاتھ آگیا تھوڑی تھوڑی دیر میں ایک اٹھتا دوسرا اٹھتا تیسرا آتا کہ میانجی چڑیا چھوڑ آؤں میانجی چڑیا چھوڑ

آوں۔ آخر سیاجی تنگ آگئے اور جھلا کر کہنے لگے کہ بس ہمیں چھوڑ دیا کرو۔ یہ قصہ اس پر چلا تھا کہ آج کل غریبوں کی بہت بیقدری ہے مگر خدا کے یہاں انکی قدر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہ قدر تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو وصیّت فرماتے ہیں یا عائشۃ جالسی المساکین وقربیھم اے عائشہ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور انکو اپنے سے قریب کرو نیز آپ دعا میں فرماتے تھے اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین اے اللہ مجھے زندگی میں بھی مسکین رکھئے اور موت بھی مسکینی کی حالت میں دیجئے اور قیامت میں بھی مساکین کی کی جماعت میں اٹھایئے سبحان اللہ کسقدر آپ کو مساکین سے محبت تھی کہ اپنے لئے انہی کیساتھ رہنا پسند فرماتے تھے۔ اسمیں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ حضور نے اس دعا میں مساکین کو اپنے اوپر بھی ترجیح دی ہے کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ کیجئے بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ کیجئے جسمیں اپنے کو تابع اور مساکین کو متبوع قرار دیا گیا ہے مگر میرے جی کو یہ نکتہ نہیں لگا کیونکہ گو آپ نے دعا اس لفظ سے فرمائی ہے مگر حقیقت میں مساکین ہی کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا وہی تابع ہوں گے اور آپ متبوع ہوں گے مساکین کی متبوعیت کا کسی درجہ میں بھی وہم نہیں باقی حضور کا ان الفاظ سے دعا فرمانا تواضع کی بنا پر ہے اسی سنت اللہ و سنت رسول کا اثر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر تھا کہ آپ کی نظر میں غربا کی قدر زیادہ تھی اسلئے آپ انکو پلاؤ زردہ اور قورمہ کھلاتے تھے اور امرا کی قدر نہ تھی اسلئے ان کو ساگ اور دال کھلاتے تھے اصل وجہ تو یہ تھی مگر جب لوگوں نے آپ سے اس نرالے برتاؤ کی وجہ دریافت کی تو آپ نے اصل بات نہیں بتلائی کیونکہ اس کے اظہار میں امرا کی دلشکنی (اور غربا کے اعجاب) کا خطرہ تھا آپنے اسکی دوسری وجہ بتلائی فرمایا کہ قاعدہ ہے کل جدید لذیذ۔ نئی چیز لذیذ ہوا کرتی ہے اسلئے میں اپنے مہمانوں کو جدید چیز کھلاتا ہوں تاکہ ان کو لذت حاصل ہو غریبوں کیلئے تو پلاؤ زردہ قورمے جدید ہیں جو ان بیچاروں کے خواب میں بھی کبھی نہیں آتے ان کو تو یہ کھلاتا ہوں اور امیروں کو چٹنی ساگ دال کھلاتا ہوں کیونکہ ان کے حق میں یہی جدید ہیں جو عمر بھر ان کے کھانے میں نہیں آتے ان کو انہی میں لذت حاصل ہوتی ہے پلاؤ زردہ تو وہ روز کھاتے رہتے ہیں وہ ان کے لئے جدید نہیں۔ سبحان اللہ! اب یہ ایک علمی مضمون ہوگیا حالانکہ ظاہر میں معمولی بات تھی۔ اہل لطائف کے

یہاں معمولی سے معمولی باتیں بھی علمی مضامین بنجاتے ہیں۔ چنانچہ اسپر مولانا ہی کا ایک اور قصہ یاد آیا ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں احباب مجتمع تھے اور سنا ہے کہ جب ان حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا تو اکثر مٹھائی کی فرمائش ہوتی تھی کہ بھائی مٹھائی کھلاؤ چنانچہ اسوقت بھی اسکی فرمائش ہوئی اور راز اسمیں یہ ہے کہ حضرات اہل اللہ میں ذکر کے انوار سے نشاط کا غلبہ ہوتا ہے اسلئے وہ اسباب نشاط کو اہل دنیا سے زیادہ برتتے ہیں دنیا داروں کو اسقدر اسباب نشاط میسر نہیں ہوتے جو ان حضرات کو میسر ہوتے ہیں دنیا داروں کو اپنے افکار ہی سے فرصت نہیں ملتی اور اگر کبھی یہ لوگ اسباب نشاط اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی ایسے ہوتے ہیں جو فکر سے خالی نہیں ہوتے مثلاً گانا بجانا شطرنج اور گنجفہ کھیلنا جو خلاف شریعت ہیں اور گناہ کو مستلزم۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمان کو گناہ کرتے ہوے خدا کا خوف ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجہ کا خوف ہو پھر خوف کے ساتھ لذت کہاں۔ اور حضرات اہل اللہ کے یہاں اسباب نشاط سب شریعت کے موافق ہوتے ہیں جنمیں گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا اُدھر اُن کا دل افکار دنیا سے خالی ہوتا ہے اسلئے انکو دنیا والوں سے زیادہ نشاط میسر ہوتا ہے شاید کوئی یہ کہے کہ اہل اللہ کو آخرت کا تو غم ہوتا ہے پھر وہ بھی فکر سے خالی نہوے تو اُن کا نشاط بھی کامل نہوا اس کا جواب یہ ہے کہ فکر آخرت لذیذ فکر ہے جس سے نشاط بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا (اسکی ایسی مثال ہے جیسے عاشق کو محبوب کی رضا کی فکر ہوا کرتی ہے۔ راتدن وہ اسی سوچ میں رہتا ہے کہ ایسا کونسا کام کروں جس سے محبوب راضی ہو مگر یہ فکر لذیذ ہوتا ہے جسکی لذت عشاق کے دل سے پوچھو۔ عاشق اس فکر سے کبھی خلاصی کا طالب نہیں ہوتا مجنون کہتا ہے ؎

یارب لا تسلبنی حبہا ابداً ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

اور کہتا ہے ؎

الٰہی تبت من کل المعاصی ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

حالانکہ محبت لیلیٰ نے اسکے دل کو جلا بھونکدیا تھا مگر اسپر بھی وہ اسکے زوال کا طالب نہیں بلکہ ترقی کا خواہاں ہے اور یہ مثال بہت ہی ناقص ہے کیونکہ مجنوں کا یہ عشق خطرۂ آخرت سے خالی نتھا اسپر اُس عشق کو کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے جسمیں لذت ہی لذت ہے۔

خطرہ کا نام نہیں مگر سمجھانیکے لئے ایک مثال ناقص بھی کافی ہے ۱۲) ہمنے ثقات سے سنا ہے کہ جب حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے تو صبح کو اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکالتے اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہید قدس سرہ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرات سب ملکر مٹھائی کھایا کرتے پھر آمیں باہم چھینا جھپٹی بھی ہوتی تھی کوئی ہنڈیا اٹھا کر بھاگ جاتے دوسرے حضرات اُن کے پیچھے دوڑتے حالانکہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت مشائخ تھے مگر اُن کی معاشرت ایسی سادہ تھی جسمیں تکلف و تصنع کا نام نہ تھا بھلا آجکل تو مشائخ ایسا کرکے دکھلائیں تو بہ۔ انکی تو شان گھٹ جائیگی متانت و وقار کے خلاف ہو جائیگا چنانچہ ہمارے یہاں ایک شخص تھا وہ کہا کرتا تھا کہ علماء و مشائخ کو متانت و وقار سے رہنا چاہیئے میں کہتا ہوں کہ اس کا وقار اُسی کو مبارک ہو ہمتو اسکو تکبر سمجھتے ہیں ہمیں چھوڑے بن ہی میں رہنے دو اور جو کوئی ہمیں چھوڑا کہے کہو ؎ اور

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں | مانمی خواہیم ننگ و نام را

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار | کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

جسکو مریدوں اور معتقدوں کی فوج تجمع کرنا ہو وہ اس متانت و وقار کو اختیار کرے اور جسکو چلانا پھونکنا اور جلنا مرنا منظور ہو اسکو ان اسباب وقار کی ضرورت نہیں بس اُسکو ضرورت ہے کہ خلاف رضائے محبوب کوئی کام نہو جو کام ہو شریعت کی حد کے اندر ہو اسکے بعد اُسکو کسی کی فکر نہیں چاہے کوئی اُسکی ساتھ رہے یا نہ رہے۔ اور میاں جسکو حق تعالیٰ عظمت دیتے ہیں اُسکی عزت ان باتوں سے کم نہیں ہوا کرتی کہ ذرا ہنسی کی باتیں کرلیں دوستوں سے چھینا جھپٹی کرلی بھاگ دوڑ لئے ہاں جسکی عزت موہوب نہو مکسوب ہو وہ بیشک متانت و وقار ہی سے بنتی ہے تو لعنت ہے ایسی عزت پر جسکے لئے انسان کو کوشش و سعی کرنا پڑے۔ غرض مولانا محمد قاسم صاحب سے احباب نے فرمایش کی کہ مٹھائی کھلایئے مولانا نے ایک روپیہ کی مٹھائی منگوائی اور اپنے ایک مقرب خادم کو جن کا نام مولوی فاضل تھا تقسیم کیلئے فرمایا چنانچہ وہ تقسیم کر چلے تو مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک لطیفہ فرمایا الفاضل للقاسم یہ جملہ ذو معانی ہے اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جو بچ جائے وہ تقسیم کرنیوالے کا ہے (یعنی مولوی فاضل کا) اور یہی معنی مولانا کی مراد بھی تھے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بچا ہوا قاسم کا ہے یعنی میرا کیونکہ مولانا کا نام قاسم تھا

اس صورت میں فاضل بمعنی لغوی ہے اور قاسم بمعنی عرفی - اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ فاضل (یعنی مسمی بہ فاضل) قاسم کے ہیں یعنی تم میسر ہوا اس صورت میں فاضل و قاسم دونوں معنی عرفی مستعمل ہوں گے مولوی صاحب نے موقعہ اور اجازت دیکھکر جوابدیا الفاضل للفاضل والقاسم محروم یہ جملہ بھی دو معنین ہیں اسمیں اگر فاضل و قاسم دونوں معنی لغوی لئے جائیں تو معنی یہ ہیں کہ بچا ہوا اُس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کیونکہ صاحب فضیلت وہی تھے) اور تقسیم کرنیوالا محروم ہے (یعنی مولوی فاضل محروم ہیں کیونکہ وہی تقسیم کر رہے تھے) اور یہ مثل بھی ہے القاسم محروم تو جسمیں قاسم بمعنی لغوی مستعمل ہے اور یہی معنی مولوی فاضل صاحب کی مراد تھی لیکن مزاح کی طور پر ایک دوسرے معنی بھی اس جملہ کی ہو سکتے ہیں جبکہ فاضل و قاسم کو معنی عرفی لیا جائے وہ یہ کہ بچا ہوا فاضل کا ہے (یعنی مسمی بہ فاضل کا) اور قاسم محروم ہیں (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) اہل اللہ کے خدام مودب ہوتے ہیں بے ادب نہیں ہوتے مگر بے ادبی اُسے کہتے ہیں جس سے مخدوم کو تکلیف ہو چونکہ مولوی فاضل صاحب جانتے تھے کہ اسوقت حضرت مولانا کی طبیعت مزاح کو چاہ رہی ہے اسلئے انھوں نے اجازت پاکر ذو معنیین جملہ استعمال کر دیا سو اس کا مضائقہ نہیں نہ یہ بے ادبی میں داخل ہے خصوصاً جبکہ اُن کی مراد ادب کے خلاف نہ تھی گو ایہام خلاف کا ہوتا ہے سو مزاح میں ایسے ایہام کی اجازت ہے جبکہ شیخ کی طبیعت مزاح پر مائل ہو یہ نہیں کہ ہر وقت موقعہ بے موقعہ ایسے جملے استعمال کیا کرو - سو دیکھیے اہل لطائف کے یہاں مٹھائی کھانے میں بھی علمی نکات ہوا کرتے ہیں اُن کا کوئی کام اور کوئی قول بھی علمی مضامین سے خالی نہیں ہوتا یہ قصہ تو تبعاً یاد آگیا تھا اصل مقصود یہ تھا کہ مولانا نے کل جدید لذیذ کے قاعدہ سے اپنے اس فعل کی وجہ بتلائی کہ میں غریبوں کو عمدہ کھانے اور امیروں کو معمولی کھانے کیوں کھلاتا ہوں اسلئے کہ ہر ایک کو جدید کھانوں سے لذت حاصل ہوا کرتی ہے تو جسکے حق میں جو جدید ہوا اسکو وہی کھلانا چاہیے اسی بنا پر میرا جی چاہا کہ اس جدید نعمت سے جو فی نفسہ قدیم ہے مگر مجھپر بہیئت مخصوصہ وارد ہونیکی وجہ سے مجھے جدید معلوم ہوئی ہے اور اُس سے مجھپر ایسا خاص اثر ہوا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے احباب کو بھی مطلع کروں وہ نعمت یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ جا رہا تھا یا بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر خود بخود یہ بات آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں اتنا ہی ہم آخرت کی طرف مسافت طے کر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک دن موت آجائے گی اور یہ مسافت

قطع ہو جائے گی جسکے بعد ہم آخرت تک پہونچ جائیں گے اور یہ مضمون ایسا ظاہر ہے کہ حدیث وغیرہ سے اسکے ثابت کرنیکی ضرورت نہیں مگر حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے الدنیا مدبرة والآخرة مقبلة او کما قال یعنی دنیا جارہی ہے اور آخرت آرہی ہے۔ اس کا وہی حاصل ہے خواہ اسکو یوں تعبیر کیا جاوے کہ ہم آخرت کی طرف جارہے ہیں خواہ یوں تعبیر کیا جاوے کہ آخرت ہماری طرف آرہی ہے دوسری تعبیر مجاز ہے پہلی حقیقت جیسا اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کیلئے اقبال ثابت فرمایا ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ واقع میں زمانہ خود حرکت کر رہا ہے اور ہماری حرکت فی الزمان مجازی ہے۔ البتہ مکان میں ہماری حرکت حقیقی ہے چنانچہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف ہم خود حرکت کرتے ہیں مکان خود ہماری طرف نہیں آتا بخلاف حرکت فی الزمان کے کہ اسکے اعتبار سے ہم متحرک مجازی ہیں کیونکہ ہمکو ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ کی طرف خود جانا نہیں پڑتا بلکہ زمانہ خود بخود حرکت کرکے آتا ہے چنانچہ ہم سوتے رہتے ہیں اور زمانہ ہمارے اوپر گذرتا رہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہوگیا کہ حرکت فی الزمان میں ہمارے قصد و اختیار کو اصلا دخل نہیں حقیقت میں زمانہ خود متحرک ہے اور ہم متحرک فی الزمان حقیقةً نہیں پس زمانیات کیلئے حرکت فی الزمان مجازی ہے اور بنا بر اس تحقیق کے لطیفہ تفسیریہ پر بھی تنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ کہ قرآن میں ہے اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون ٥ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جب اُن کی میعاد (معلوم یعنی موت) آجائیگی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ موت کے آنیکے بعد اس سے کوئی بچ نہیں سکتا اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ اس آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ رہ سکنا اس سے لا یستاخرون عنہ ساعة کا دخل تو ظاہر ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنیکے بعد اُس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخر کو دخل ہو سکتا ہے مگر لا یستقدمون کو ہمیں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اسکا مطلب یہ ہی کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں مر سکتا سو یہ حکم تو صحیح ہے مگر جو مقصود ہے اسمیں کیا دخل کیونکہ تقدیم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو ورا و لٹا مضر ہوگا بچہ خصوص

مجیئی اجل کے بعد تو عقلاً بھی اسکا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہوسکتا تھا اسلیئے اُسکی نفی بیشک مفید ہے .... تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اسکے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمہ اللہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گذرا اور نہ مجکو اس تلاش کا اہتمام ہے ہمیں تو خدا تعالیٰ نے مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جنکی باتوں سے ایسی تسلی ہو جاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغنا ہو گیا مولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا مبنیٰ تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہو سکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہو سکتی اسطرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کیلئے مقرر ہوا اور وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہو جائے دوسرے یہ کہ وقت موت سے مؤخر وقت میں چلا جاوے مثلاً جمعہ کا دن آنیکے بعد موت کے آثار دیکھکر سنیچر کے دن میں پہونچ جائے تو دونوں صورتوں میں موت نہ آئے گی کیونکہ وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کردیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہو سکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اسلئے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کر دیئے ورنہ اصل مقصود آیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنیکے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جسکو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لا یستاخرون ولا یستقدمون (جیسے وما یبدئ الباطل وما یعید میں ابدا و اعادہ کے معنی حقیقی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کارآمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کر دیا گیا اسی طرح یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاخر و تقدم کی حقیقۃً نفی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے اور محاورات میں کسی شئے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں) اس تقدیر پر آیت کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ ع

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ می دارد ... برنگ اصحاب صورت را ببو اصحاب معنی را

قرآن میں لطائف عقلیہ کی بہت گنجائش ہے گو وہ لطائف مسوق لہا الکلام نہوں اس بنا پر ایسے نکات جو قواعد شرعیہ و عربیہ کے خلاف نہوں قرآن میں بیان کرنیکا مضائقہ نہیں۔ الغرض

یہ بات میرے دل میں آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور ہر وقت ہر ساعت برابر چل رہے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ آخرت برابر ہماری طرف چلی آرہی ہے یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون ۰ اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظ رح کے اس شعر کی ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ۔ جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا ۔

اسکی ایک تفسیر یہی کیگئی ہے کہ دنیا میں امن و عیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گذر رہا ہے وہ اسکی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جسکی عمر بیس سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جسکی زیادہ عمر ہے اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے (سچ کہا ہے کسی نے ؎

تسر المرء ما ذھب اللیالی ۔ وکان ذھابھن لہ ذھابا +

انسان کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ میرے بچہ کی عمر دس سال یا بیس سال کی ہو گئی اور یہ خبر نہیں کہ وہ اسی قدر موت سے قریب ہو گیا ہے ۱۲ جامع) اسی مضمون کو حافظ رحمۃ اللہ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے اور جرس کا لفظ اس بنا پر اختیار فرمایا کہ اس زمانہ میں قافلہ کیساتھ جرس رہنے کی عادت تھی جیسے آج کل اسٹیشن پر گھنٹی بجا کرتی ہے یہ بھی جرس کی یادگار ہے مگر آج کل بدؤں میں جرس کی جگہ حیّ بولنے کا دستور ہے بس انکی حیّ کہتے ہی دوسرے میت ہو جاتے ہیں کیا مجال ہے جو اس آواز کے بعد قافلہ کے چلنے میں ذرا بھی توقف ہو سکے ریل کی سیٹی کے بعد دیر ہو سکتی ہے مگر ان کی حی کے بعد دیر نہیں ہوتی یہ تفسیر تو اس شعر کی اہل زہد کے مذاق کی ہے اور عارفین کے نزدیک اسکی اور تفسیر ہے کہ مجھے منزل محبوب میں امن و عیش کہاں کیونکہ یہاں تو ہر وقت جرس کی فریاد ہے کہ اس منزل پر نہ ٹھہرو اسباب باندھ کے آگے چلو آگے چلے تو وہاں بھی قیام نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی تاکید ہے خلاصہ یہ کہ سلوک میں ترقی کرتے رہو کسی ایک حال پر قناعت نہ کرو ایک مقام پر ٹھہرو نہیں تو جب سالک کو ہر دم ترقی کی فکر ہے تو اسکو امن و عیش کہاں اس مضمون کو دوسرے عارف نے اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا که می بالد بخود این راہ چون تاک از بریدنہا

کہ یہ راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہوسکتا جتنا چلتے ہیں اتنا ہی راستہ نکلتا چلا آتا ہے جیسے پہاڑوں کے بیچ میں راستہ ہوتا ہے کہ دور سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے دونوں پہاڑ ملے ہوئے ہیں بس اسکے بعد راستہ ختم مگر جوں جوں قریب پہونچتے ہیں راستہ نکلتا آتا ہے یہی حال طریق سلوک کا ہے کہ اس کا منتہی کسی جگہ نہیں مگر حافظ نے اس مضمون کو مبہم فرمایا ہے جس سے صاف یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طریق سلوک کے متعلق فرمارہے ہیں اسی لئے لوگ ملو کبابی شرابی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا کلام مختلف محامل پر محمول ہوسکتا ہے مولانا رومی نے اسکو صاف صاف بیان فرمایا ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

اور دنیا میں تو سلوک کی انتہا ہے ہی نہیں بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ آخرت میں بھی ترقی بند نہو گی بلکہ وہاں بھی ہر دم ترقی ہوتی رہے گی کیا عجب ہے کہ خلود اسی واسطے ہو کیونکہ جب راستہ بے نہایت ہے تو اسکے طے کرنے کے لئے سالک کو بھی عمر بے نہایت تک زندہ رہنا چاہئے اور جب آخرت میں بھی ترقی بند نہو گی تو ممکن ہے کہ جس طرح بعض لوگ وہاں پر جنت وحور میں مشغول ہوں گے بعض ان سے بڑھکر ہوں جو محض دیدار الٰہی میں مشغول ہوں اور انکو تجلیات میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی ہو۔ اسی لئے بعض کا قول ہے ان فی الجنان جنة لیس فیہا حور ولا قصور ولکن ارنی ارنی۔ یعنی جنتوں میں ایک جنت ایسی بھی ہے جہاں نہ حور ہے نہ قصور بلکہ صرف تمنائے دیدار ہوگی اور وہاں کے رہنے والے ہر وقت یہی پکاریں گے ارنی ارنی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ حور و قصور میں ہوں گے وہ علی الاطلاق ان سے کم درجہ والے ہوں بلکہ مجموعہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جنکو حور و قصور ہی کا مشاہدہ ہے اور ان کو اسمیں جمال حق نظر نہیں آتا اور خاص خاص مدت میں تجلی حق سے مشرف ہوتے ہیں دوسرے وہ جو صرف جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں ان کو کسی طرف التفات نہیں تیسرے وہ جو جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق رہ کر اس درجہ پر پہنچ گئے کہ ہر چیز میں ان کو جمال حق کا ہی مشاہدہ ہوتا ہے اور ظاہر میں حور و قصور سے بھی متمتع ہو رہے

ہیں تو یہ اَرِنی والے پہلے درجہ والوں سے تو بڑھے ہوئے ہوں گے مگر تیسرے طبقہ سے فضل ہوں گے بلکہ تیسرا طبقہ اُن سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس مذاق کے لوگ دنیا میں بھی نظر سے گذرے ہیں جنکو جمال حق کے سامنے حور و قصور کی پروا نہ تھی حضرت مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی فرماتے تھے کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آوینگی" یہ بات اس طرح فرمائی گویا یہ طے شدہ بات ہے کہ جنت میں تو ضرور ہی جائیں گے یہ غلبہ رجا تھا تو ہم حوروں سے کہیں گے کہ بی قرآن پڑھو تو یہاں بیٹھو ورنہ چلتی بنو مگر اسوقت مولانا پر غلبہ حال تھا عشق کا حال غالب تھا کبھی عارف پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ایسی باتیں کہجاتا ہی اور جب معرفت کا غلبہ ہوتا ہے اُسوقت اُسکو کوئی چیز مشاہدہ جمال حق سے مانع نہیں ہوتی جملہ اشیا مرآۃ جمال محبوب بنجاتی ہیں اُسوقت وہ یوں کہتا ہے ؎

ماچو چنگیم و تو زخمہ می زنی ✣ زاری از ما نے تو زاری میکنی

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرات اکابر صوفیہ جیسے حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ عمدہ لباس اور عمدہ غذائیں اسلئے استعمال کرتے تھے کہ انکو ان چیزوں میں نعمائے جنت کے اظلال نظر آتے تھے تو عارف کو بعض دفعہ ہر چیز میں ظل جمال حق نظر آتا ہے اُسوقت یہ حال ہوتا ہے کہ وہ خود کو بھی حاجب نہیں سمجھتا بلکہ وہ اسکے لئے ایسی بنجاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت محبوب نظر آیا کرتی ہے اور جسوقت معرفت کا غلبہ نہو بلکہ عشق کا غلبہ ہو تو وہ اس سے زیادہ کہتا ہے یعنی اپنے کو بھی حجاب سمجھتا ہے حور کو تو کیوں نہ سمجھے گا حضرت قلندر رح فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم ✣ گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد ✣ تا نہ بینم رخ تو روح رسیدن ندہم

اور عارف اپنے کو بھی مرآۃ سمجھتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ ✣ تو ز غنچہ کم ندمیدہ در دل کشا بچمن درآ

چنانچہ صوفیہ نے قلب میں تمام عالم ناسوت و ملکوت کو مندرج مانا ہے اسلئے وہ کہتے ہیں کہ تمکو چمن اور سرو و سمن کی سیر کی ضرورت نہیں اپنے دل کا دروازہ کھولکر اسکی سیر کرو اسی

سب کچھ موجود ہے اور دوسرے آثار کو بھی جیسا مولانا نے ایک صوفی کا قصہ لکھا ہے ؎

صوفیٔ در باغ از بہر کشاد ✦ صوفیانہ روی بر زانو نہاد

یعنی وہ سر جھکائے باغ میں مراقب بیٹھا تھا کسی نے کہا فانظر الی اثار رحمۃ اللہ صوفی نے جواب دیا کہ میں تو آثار رحمت ہی کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور تم آثار الآثار کو دیکھ رہے ہو اس صوفی نے تفسیر میں تغیر نہیں کیا بلکہ استدلال کیا ہے کہ جب ان آثار رحمت کے مشاہدہ کا امر ہے جو ظل اثار رحمت ہیں تو اصل آثار کے مشاہدہ کا امر کیوں نہ ہوگا جو مومن کے قلب میں ہیں تو مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کو غلبۂ عشق میں یہ یاد نہ رہا کہ وہاں حور بھی حجاب نہ ہوگی یعنی مشاہدۂ جمالِ حق سے مانع نہ ہوگی اسلئے یہ فرمایا کہ حوریں آئیں گی تو ہم اُن سے کہیں گے کہ بی قرآن سناؤ تو سمجھو ورنہ چلی جاؤ سو تو وہاں حوروں سے باتیں کرنے میں بھی وہی قرب ہوگا جو تلاوت قرآن میں حاصل ہوتا ہے تو غالباً وہ جنت جسمیں ارنی ارنی کی صدا ہوگی وہاں ایسے ہی عشاق کا مجمع ہوگا عارفین کاملین ان سے بھی اوپر کے درجہ میں ہوں گے جہاں حور و قصور سب کچھ ہوں گے اور کوئی چیز مانع مشاہدۂ حق سے نہ ہوگی مگر جنت میں کسی ایسی جنت کا ہونا صرف اس صوفی کے قول سے معلوم ہو رہا ہے احادیث سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملا پس یا تو اس کو کشف پر محمول کر کے سکوت کیا جائے یا تاویل کر کے احادیث پر منطبق کر لیا جائے تاویل یہ کہ صوفی کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی جنت کوئی مستقل ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حور و قصور والی جنت میں ایک حالت ایسی ہوگی جسمیں غیر کی اصلا گنجائش نہ ہوگی بلکہ اسوقت مشاہدۂ جمال حق میں بجز ارنی کے اور کوئی تمنا نہ ہوگی نہ کسی کی طرف التفات ہوگا چنانچہ یہ مضمون دو حدیث کے مجموعہ میں ہے ایک یہ کہ جب اہل جنت جنت میں پہونچ جائیں گے تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے جنت والو تم اور کچھ چاہتے ہو وہ کہیں گے خداوندا آپنے ہمکو بہت کچھ عطا فرما دیا ہے ارشاد ہوگا کہ لو ہم تمکو اس سے بھی افضل نعمت عطا کرتے ہیں اور اسکے بعد حق تعالیٰ تجلی فرمائیں گے حدیث میں آتا ہے کہ اس نعمت سے زیادہ لذیذ اہل جنت کے نزدیک کوئی نعمت نہ ہوگی رواہ مسلم اور جب تک اُس تجلی میں مشغول رہیں گے کسی نعمت کی طرف التفات نہ کرینگے رواہ ابن ماجہ ان حدیثوں سے اس صوفی کے قول کی

مناسب تاویل ہو سکتی ہے پس اس بناء پر جنت میں بھی ترقی مظنون ہوئی تو بعض نے ترقی مسلوک کو اس شعر حافظ کا محمل ٹھہرایا ہے اور بعض نے دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کو محمل کہا ہے اور میں ابھی کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ آخرت کی طرف چل رہے ہیں ہمکو ہر وقت یہ مراقبہ پیش نظر رکھنا چاہئے اور جس طرح سفر قطع کرنے میں ہر وقت اسپر نظر رہتی ہے کہ کون امر اس سفر میں معین ہے تو اسکی تحصیل کرتا ہے اور کون امر مانع ہے اُس سے دور رہتا ہے اسی طرح اس سفر الی الآخرۃ میں بھی ہر دم ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آخرت کی منزل میں مفید ہوگا یا مضر۔ اب بعض امور تو معین آخرت ہونگے جیسے ذکر اللہ۔ امر بالمعروف تلاوت قرآن۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہا یہ تو معین ہیں مقصود میں یعنی حصول نجات میں اور یہی منزل پر پہونچنا اور بعض امور مانع عن الوصول ہیں جیسے معاصی ظاہرہ و باطنہ اور بعض امور ظاہر میں نہ معین ہیں نہ مانع۔ جیسے امور مباحہ۔ کہ ان کے کرنے میں ثواب نہیں (الا بنیۃ مخصوصۃ ۱۲) اور ترک میں گناہ نہیں اسکو عام لوگ مستقل قسم ثالث سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں اثر کے اعتبار سے یہ تیسری قسم نہیں بلکہ اُن دونوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کی طرف راجع ہے۔ کیونکہ مباح بھی اثر محمود وا اثر مذموم سے خالی نہیں ہوتا فعل مباح کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے یا محمود یا مذموم گو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ محمود ہو نہ مذموم مگر ایسا نہیں ہوتا کہ اُس کا اثر بھی غیر محمود و غیر مذموم ہی ہو بلکہ اثر یا محمود ہوتا ہے یا مذموم پس اگر اُس کا اثر محمود ہے تو وہ قسم اول اعمال مفید آخرت میں داخل ہے اور اگر اثر مذموم ہے تو قسم دوم مضر آخرت میں داخل ہے اس تقریر کے بعد ایک حدیث کا اشکال رفع ہو گیا حدیث یہ ہے من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (مسلمان کے اسلام کی خوبی میں سے یہ بات ہے کہ وہ لایعنی اور فضول کاموں کو ترک کردے ۱۲) اسپر اشکال یہ ہوتا ہے کہ لایعنی سے امور محرمہ تو مراد ہو نہیں سکتے کیونکہ اُن کا ترک تو واجب و لازم ہے اور سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وجوب ترک مراد نہیں بلکہ محض ترغیب ترک دی جارہی ہے تو یقیناً لایعنی سے مراد امور مباحہ ہیں تو اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ امور لایعنی مانع عن الوصول اور مضر آخرت نہیں ہیں تو اُن کے ترک کی ضرورت کیا ہے تقریر گذشتہ سے معلوم

ہو گیا کہ امور مباحہ کو لایعنی کہنا یہ محض درجۂ ذات کے اعتبار سے ہے اور حضور نے بھی اسی درجہ کے اعتبار سے اُن پر لایعنی کا اطلاق فرمایا ہے ورنہ آثار کے اعتبار سے یہ امور یا مفید ہیں یا مضر اور اسی درجۂ آثار کے اعتبار سے حضور اُن کے ترک کا امر فرما رہے ہیں اور اسکو کمال اسلام کی خوبی بتلا رہے ہیں پس اگر کوئی مباح مفید آخرت ہو تو اسوقت وہ لایعنی نہ ہوگا مثلاً مزاح کرنا بچوں سے یا دوستوں سے یہ فی نفسہ مباح ہے جسمیں نہ ثواب نہ گناہ مگر اثر کے اعتبار سے یا مفید آخرت ہے یا مضر۔ اگر مفید ہوا تو لایعنی نہ رہے گا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مزاح فرمایا ہے حالانکہ یقیناً آپ امور لایعنی سے بری تھے اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی نیت کو دیکھو کہ مزاح سے مقصود کیا ہے۔ ہمارے یہاں تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا ہم لوگ اکثر کام بدون کسی خاص ارادہ اور نیت کے کرتے ہیں محض عادت کی بنا پر اکثر کام ہوتے ہیں اور اگر کسی مقصود کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو وہ نفس کی کوئی غرض ہوتی ہے بلکہ ہم کیا کہیں ہماری تو نماز بھی نفس ہی کیلئے ہے اسمیں بھی کوئی نیت خالص آخرت کیلئے نہیں ہوتی اسی لئے نماز پڑھکر ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ یہ کس منہ سے کہیں کہ اے اللہ قبول فرمالے بلکہ یوں دعا کرتے ہیں کہ خدا معاف کرے تو ہمارے یہاں مزاح میں تو کیا نیت ہوتی امور واجبہ و مفروضہ میں بھی کوئی خاص نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر افعال عادت کی وجہ سے خود بخود صادر ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی نیت ہوتی بھی ہے تو وہ نفس کی غرض سے خالی نہیں ہوتی۔ خیر یہ تو ہمارا حال ہے اسکو تو رہنے دیا جائے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو یقیناً کچھ مصالح ضرور ہوں گے حضور کے مزاح میں تو مصالح کیوں نہ ہوتیں عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں حضور کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنی مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جسمیں ایک کام تو آپ کا تھا یہ پہونچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے جسکے لئے حضور کی خداداد ہیبت کسقدر مانع ہو سکتی تھی کیونکہ حضور کو حق تعالی نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی جسکی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اسکو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اُس کا دل نہ کھلجائے اسوقت تک وہ

فیض نہیں لیسکتا بس یہ حال ہوجاتا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجا ہے ... تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچکر آتا ہے کہ یوں کہونگا یہ پوچھونگا صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں ؎

یوں کہیے یوں کہتے جو وہ آجاتا ... سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اسلیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے تاکہ اُن کا دل کھلجائے اور بے تکلف ہوکر استفادہ کرسکیں۔ اور حضور کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی جب حضور کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جارہے تھے کہ دفعۃً آپنے پیچھے مڑکر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پیر بھائی تھے جنمیں گونہ مساوات ہوا کرتی ہے مگر اُن پر بھی آپکا اسقدر رعب تھا مگر شاید کہیں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات معتقد تو تھے تو سنئے کہ غیر معتقدین پر آپکے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہوکر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے ؎

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم ... تا من اسپ و رخت را آنجا کشم

قوم گفتندش کہ اورا قصر نیست ... مر عمر را قصر جاں روشنے ست

(اس موقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہوگیا مگر بہت ضبط سے کام لیا ۱۲) لوگوں نے کہا کہ عمر کیلئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس اُن کا تو دل ہی قصر و ایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جسکے نام سے سلاطین کانپتے ہیں اُسکے نہ محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کرو کہیں ملجائیں گے اب وہ آپ کی تلاش میں چلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لیگئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی

کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں پولیس آخر وہ جنگل کی طرف چلا جسوقت اُس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اسکے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اُس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اُس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ و حشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہانتک کہ جب قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تن تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اُسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کے بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بیفکر سو رہے ہیں اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بوقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا جو نہی نظر پڑی ہے پیر اٹھانیکی ہمت نرہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسوقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جنکے دربار میں رعب داب کے ہزار سامان ہوتے تھے مگر مجھپر کسی کا رعب طاری نہوا آج کیا بات ہے کہ اس بے سر و سامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اسکے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہو گیا بیشک ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمت نہوئی کہ حضرت عمر کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ دیر تک کھڑا کانپتا رہا کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے آپنے انکو پاس بلایا اور تسلی دی جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیر و نکو مرعوب دیکھکر فرمایا تھا کہ تم مجھسے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اُس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی حضرت عمر کی باتیں سننے کے بعد یہ ہیبت مبدل

یہ محبت ہوگئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنیکی ہمت ہوئی جسکے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے پھر وہ اسلام سے مشرف ہوگیا۔ یہ تو حضرات صحابہ کرام کی حالت تھی ہمنے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انکو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی اُن سے بات کرنیکی ہمت نہوتی تھی حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے رعب وہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سے بے تکلف باتیں نکر سکتے تھے حضرت کا اُن پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے اور ڈرتے تھے اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اسلئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیارے ہوتے ہیں بات بات میں اُنکو غصہ آجاتا ہے اسلئے اُن کے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں جیسے مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب تھے یا آج کل بھی ایک بدنام ہے (ہائے ۵ ہزار نام خدا ہے تو وہ بدنامی تو ۱۲ جامع) مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا ہمنے تو کبھی بھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اسپر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبتِ حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کیلئے مانع فیض ہوجاتی ہے اسلئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام اپنے اصحاب و احباب سے گاہے مزاح کرلیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھلجائے اور ہیبت و محبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہوجائے اسی لیے اہل آداب نے لکھا ہے کہ مہمان کے سامنے اپنے ملازمین پر بھی غصہ نہو کیونکہ اس سے مہمان کو وحشت ہوگی اور وہ گھبرائے گا کہ معلوم اس شخص کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہو اور شاید اس وحشت کی وجہ سے وہ کھانا بھی کم کھائے کہ نہ معلوم یہ کیسے مزاج کے ہوں گے انکو زیادہ کھانا کہیں ناگوار نہو۔ واقعی یہ ہیں آداب اور ہمنے تو اخلاق کا محض نام سُن لیا ہے مگر بھائی کیا کریں کھٹے ہیں یا میٹھے سب اسی باغ کے پودے ہیں۔ جب کوئی باغ لگاتا ہے تو سارے درخت میٹھے ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ کوئی میٹھا ہوتا ہے کوئی کھٹا اور اسمیں بھی حکمت ہے وہ یہ کہ سب میٹھے ہی پھل ہوں تو اُن کے کھانے سے تخمہ اور ہیضہ کا اندیشہ ہوتا ہے جب میٹھے پھلوں کے ساتھ کوئی کوئی کھٹا بھی ملجائے تو سب ہضم ہوتے ہیں اسی لئے اکثر لوگ دیسی آموں کو پسند کرتے ہیں کہ ان میں کھٹے میٹھے ملے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ ساتھ کے ساتھ ہضم ہوتے رہتے ہیں اور مالدہ آم سب میٹھے ہوتے ہیں انکو زیادہ کھالو تو ہیضہ ہوجائے اسی طرح خدا تعالیٰ نے

باطنی باغ میں بھی کوئی درخت بیٹھا رکھا ہے کوئی کھٹا باقی ہیں سب اُسی باغ کے درخت اسلئے
اعتراض کی کوئی وجہ نہیں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب حالانکہ بہت بڑے ولی و
عارف تھے مگر فطرتی طور پر تیز مزاج تھے اُن کی تیزی تکبر یا بناوٹ سے نہ تھی بلکہ طبعی تھی اور
مشاہدہ سے یہ بات خود معلوم ہو جاتی ہے کہ کس میں طبعی تیزی ہے اور کون تکبر کی وجہ سے تیزی
کرتا ہے چنانچہ شاہ صاحب کے یہاں ایک مرتبہ ایک شخص آیا اُس نے مسجد میں آکر اپنا سامان
رکھا مولانا نے دیکھتے ہی فرمایا ارے نکالو اسکو وہ بھی تھا کوئی دلیر۔ کہنے لگا دیکھوں تو وہ
کون ہے جو مجھے نکالے گا۔ اب کسی خادم کی ہمت نہ ہوئی جو اُسے نکالے۔ اور مولانا بار بار فرما رہے
ہیں کہ ارے نکالو اسکو مگر کوئی نہ اٹھا آخر کو مولانا خود اٹھے اور اُس کا سامان اٹھا کر مسجد سے باہر
پھینکدیا اُس نے اتنا ادب کیا کہ مولانا کو اسباب اٹھاتے ہوئے کچھ نہیں کہا جب وہ اسباب
لیکر چلے خود بھی ساتھ ہو لیا جب مولانا نے اسباب کو مسجد سے باہر رکھا اُس نے اٹھا کر پھر مسجد
میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپنے پھر اسباب اٹھا کر مسجد سے باہر
پھینکدیا مسافر نے اٹھا کر پھر اندر رکھ لیا غرض چند مرتبہ ایسا ہی ہوا آخر کو مولانا تھک گئے تو اپنی
جگہ پر آبیٹھے اور وہ مسافر اپنی جگہ جما ہوا بیٹھا رہا۔ ان حضرات کے غصہ کی ادا ہی سے معلوم
ہو جاتا ہے کہ اس کا منشا تکبر نہیں اگر مولانا کے غصہ کا منشا تکبر ہوتا تو خود اٹھکر اسکا اسباب لا کر
باہر نکالتے متکبرین ایسا کبھی نہیں کر سکتے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدام کے واسطے سے کرتے ہیں خود
ایسے کام کبھی نہیں کرتے مگر مولانا نے اسکی پروا بھی نکی جب کوئی خادم نہ اٹھا تو خود اُسے نکالنے
چلے یہ تو ہو لیا اور پیچھے کھانیکا وقت آیا تو مولانا نے اس مسافر کیلئے گھر سے کھانا بھجوایا اب اُس نے
نخرے شروع کئے کہ جاؤ میں نہیں کھاتا یہ روٹیوں ہی کی وجہ سے مسافروں کو دھکے دئے جاتے
ہیں کیونکہ گھر سے کھانا پڑتا ہے تو میں ایسی روٹیوں سے باز آیا خادم نے جاکر اطلاع کی کہ حضرت
مہمان نے کھانا نہیں کھایا اور یوں یوں کہتا ہے کوئی متکبر ہوتا تو یہ جواب سنکر خاموش بیٹھ جاتا مگر
مولانا کی طبیعت نے مسافر کا بھوکا رہنا گوارا نہ کیا خود کھانا لیکر آئے اور اُسکی خوشامد کی کہ بھائی
تو میرے کہنے کا بُرا نہ مان میرے یہاں اکثر لوگ دنیا کے قصے لاتے ہیں کوئی مقدمہ کی باتیں
لاتا ہے کوئی اولاد کیلئے دعا کراتا ہے دین کے طالب کم آتے ہیں اسلئے مجھے غصہ آجاتا ہے غرض

اسکو کھانا کھلایا مگر یاد رہے کہ یہ معاملہ لطف کا ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو صرف مہمان بنکر آئیں کہ انکو خوشامد کرکے کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو شخص مہمان بنکر نہ آئے بلکہ اپنی اصلاح کیلئے آئے اُس کا یہ حق نہیں کہ شیخ اُسکی خوشامدیں کرکے کھانا کھلائے بلکہ اُسکے ذمہ ہے کہ اپنے کھانیکا خود انتظام کرے وہ اگر نخرے کریگا تو دماغ کی اصلاح کیجائے گی اسکی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تو تحصیلدار کے گھر مہمان ہوکر جائے اُسکو تو تحصیلدار خاطر مدارات کی ساتھ کھانا کھلائیگا اور ایک شخص تحصیلدار کے یہاں مقدمہ لیکر جائے اُس کا یہ حق نہیں ہے کہ تحصیلدار اُسے کھانا کھلائے بلکہ اُسکی ساتھ ضابطہ کا برتاؤ ہوگا اُسے اپنے کھانے کا خود انتظام کرنا پڑے گا اور اوقات مخصوصہ پر عدالت کے اندر گفتگو کا موقعہ ملے گا ہر وقت بات چیت کرنیکی بھی اُسے اجازت نہو گی نہ اُسکی ساتھ حاکم مزاح و دل لگی کریگا کیونکہ وہ مہمان نہیں ہے بلکہ صاحب غرض ہے آج کل یہ بھی ایک وجہ ہے بزرگوں کو بدنام کرنیکی کہ وہ مہمان اور طالب سبکی ساتھ یکساں برتاؤ چاہتے ہیں حالانکہ مہمان کا اور حق ہے طالب کا اور حق ہے مہمان تو اگر فاسق بھی ہو بلکہ کافر بھی ہو تب بھی اُسکی ساتھ خاطر و مدارات کا معاملہ کیا جائیگا اور طالب کے ساتھ یہ معاملہ نہو گا کیونکہ طالب سے مہمانوں کیطرح معاملہ کرنے سے اُسکی اصلاح نہیں ہوسکتی غرض بزرگوں نے جو گاہے اپنے متعلقین سے مزاح کیا ہے اُسکی حکمت یہ بھی کہ اس سے طالب کا دل کھل جاتا ہے تو وہ استفادہ بخوبی کرسکتا ہے مگر یہ حکمت اُن بزرگوں کے مزاح میں ہے جنکے ذمہ تبلیغ و اصلاح کا کام ہے اور بعضے ایسے بھی ہیں جو آزاد طبع ہیں وہ تبلیغ وارشاد سے گھبراتے ہیں اُن کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار | دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

وہ حضرات اس قاعدہ کے پابند نہیں اُن کے مزاح میں ایک دوسری حکمت ہوتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں اسلئے مزاح و دل لگی کرتے رہتے ہیں تاکہ چھچھورا پن ظاہر ہو اُن کو اسکی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی ہمکو چھچھورا سمجھکر چھوڑ دیگا معتقد نرہے گا اُن کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار | کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

مگر یہ رند وضع سوز ہوتے ہیں شرع سوز نہیں ہوتے۔ وضع و ناموس کو جلا پھونک دیتے ہیں مگر

شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور جو وضع سوز ہونیکی ساتھ شرع سوز بھی ہو وہ یا تو فاسق ہے یا مجذوب ہے ان دونوں کے مزاح کی حکمت بیان کرنیکی ہمیں ضرورت نہیں فاسق تو ولی ہی نہیں اور مجذوب گو ولی ہوتا ہے مگر اُسکے افعال میں حکمت کا قصد نہیں ہوتا گو واقع میں حکمت ہوا کرے۔ سو ان دونوں سے یہاں بحث نہیں یہاں گفتگو اُن بزرگوں کے مزاح میں ہے جو اپنے افعال میں حکمت کا قصد کرتے ہیں تو اُن میں جو آزاد ہوتے ہیں میں نے اُن کے مزاح کی حکمت بتلادی کہ وہ اپنی وضع کو جلا نیکے لئے اور ناموس کو خاک میں ملا نیکے لئے مزاح کیا کرتے ہیں وہ اُن مصالح پر نظر نہیں کرتے جنپر اہل سلسلہ کو نظر ہوتی ہے کار ملک است الخ میں اہل سلسلہ ہی مراد ہیں کہ وہ انتظام سلطنت کرتے ہیں اُن کو مصالح کی رعایت کرنا پڑتی ہے سو وہ کریں رند کو اسکی ضرورت نہیں وہ تو ہر وقت اپنے مٹانیکی کوشش کرتا ہے اور بعض دفعہ یہ صفت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ یوں کہنے لگتا ہے ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

اور یوں کہتا ہے ؎

جوشش عشق است کاندر مے فتاد آتش عشق ست کاندر نے فتاد

اُسوقت جوش میں کوئی اسکے برابر نہیں ہوتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے ہی عشق کا اثر پروانہ اور شمع میں ہے اور میرے ہی جوش کا ظہور مے اور نے میں ہے۔ اور یہ بات محض مبالغہ کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے بھی موافق ہے کیونکہ انسان عالم اکبر ہے اور عالم ناسوت عالم اصغر ہے اور عالم اصغر عالم اکبر سے مستفید ہے اسلئے جن چیزوں کا عالم ظاہر میں ظہور ہو رہا ہے سب قلب عارف کے آثار ہیں اگر اس طرح نہ سمجھو تو یوں سمجھو کہ خلق عالم سے انسان مقصود ہے تو انسان سبکی اصل ہے اور یہ عالم انسان کی فرع ہے اسلئے عارف کا یہ کہنا درست ہے کہ میرے ہی سے تمام چیزوں نے جوش و مستی کا سبق سیکھا ہے یعنی میری ہی وجہ سے ان کا ظہور ہوا ہے جسکے بعد یہ صفات اُن میں پیدا ہوئیں اگر میں نہوتا تو کسی چیز کا ظہور نہوتا نہ کسی میں جوش و مستی کا اثر ہوتا۔ یہاں پر کسی کو لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات و ارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے

بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم صغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اسکی فرع کیونکر ہو سکتا ہے **جواب** یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اسکی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جسپر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مرکر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دوبارہ زندہ کر دینا اسپر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم ہی پر اشکال تھا اسکو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کیلئے اکبریت مسلم ہے گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اسمیں انسان سب سے اشرف واکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے فرماتے ہیں ءانتم اشد خلقا ام السماء بناها رفع سمکها فسواها واغطش لیلها واخرج ضحٰها ؀ یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء فسواهن سبع سمٰوات ؀ جس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب انسان ہی کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور ارشاد ہے وسخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض اور وسخر لکم الشمس والقمر دائبین ؀ اور وسخر لکم اللیل والنهار وآتاکم من کل ما سألتموه ۔ اسکے علاوہ بہت سی آیات میں بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو انسان کیلئے کسی نہ کسی کام میں لگا رکھا ہے پس اس درجہ میں انسان کا عالم اکبر ہونا نصوص کے خلاف نہیں رہا یہ شبہ نکیا جائے کہ انسان اگر سبکی اصل ہے تو جسامت میں چھوٹا کیوں ہے کیونکہ اصل کیلئے جسامت میں فرع کے برابر یا بڑا ہونا لازم نہیں دیکھو درخت کی اصل ایک گٹھلی ہے جو جسامت میں درخت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی مگر سارا درخت اسی ذرا سی گٹھلی کی فرع ہے ۱۲ جامع پس اب کسی رند کے اس قول پر کچھ اشکال نہیں ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن ؏ پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

اسپر مجھے ایک ایسے ہی رند کی حکایت یاد آئی وہ حج کو جارہے تھے اور حالت یہ تھی کہ ایک ڈھیلی ہاتھ میں ناچتے کودتے ڈھیلی بجاتے جارہے تھے لوگوں نے کہا کہ میاں تم حج کو جارہے ہو یہ کیا حرکت ہے تو وہ یہ جواب دیدیتے کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں تم کون ہو واقعی حق تعالیٰ سے اسکے بندوں کو ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس جواب کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں۔ غرض وہ اس طرح حج کو جارہے تھے یہانتک کہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور مطوف کیساتھ طواف کیلئے چلے جسوقت دروازۂ حرم پر پہونچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے (بیت اللہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آجاتا ہے) بس بیت پر نظر کا پڑنا تھا کہ اس عاشق کو وجد طاری ہوا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور زبان پر یہ شعر تھا ؎

چو رسی بکوے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مبادا بار دیگر نرسی بدین تمنا

بس یہ شعر پڑھتے پڑھتے دروازہ ہی پر گر پڑے اور جان دیدی ہائے وصل کی بھی تاب نہوئی بس صورت دیکھتے ہی ختم ہوگیا عاشق کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے نہ اسے وصل میں چین ہے نہ فصل میں قرار ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے ؎

من شمع جاں گدازم و تو صبح دلکشائی   سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیک آں چنانم و دور آں چناں کہ گفتم   نے تاب وصل دارم و نے طاقت جدائی

وصل کی تاب نہ تھی جبھی تو دیکھتے ہی ختم ہوگیا اے صاحب! اگر وہ بیت کے پاس ہی پہونچ جاتا تو کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رب البیت سے جاملا۔ اسوقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ جسکو ہم رند لاابالی سمجھ رہے تھے یہ عاشق عارف تھا بس اپنی حالت چھپانیکے لئے اس نے یہ صورت بنا رکھی تھی تمام مصالح کو خاک میں ملادیا تھا اسکی پرواہ نہ تھی کہ کوئی کیا کہے گا مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اوپر کا مصالحہ تو جلانے سے خاک ہوگیا اور یہ گرم مصالحہ جو اندر اندر پھونکتا ہے باقی رہ گیا اس نے خود اسی کو جلا پھونک دیا۔ تو ان رندوں کے مزاج و دل لگی میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ وہ اسکے ذریعہ سے تمام مصالح کو مسالہ کی طرح پیس دیتے ہیں اور اپنی وضع و ناموس کو مٹا کر اپنی باطنی حالت کو پردہ میں رکھتے ہیں مگر اس غرض کیلئے ناجائز امور کا ارتکاب جائز نہیں ورنہ پھر وہ وضع سوز ہی نہ رہے گا شرع سوز بھی ہو جائیگا جسکے افعال قابل اعتبار نہیں

نہ ان میں کوئی حکمت ہے۔ تو اب ان حکمتوں پر نظر کر کے مزاح بھی لایعنی نہ رہا بلکہ بایعنی میں داخل ہو گیا اسی طرح تمام مباحات کو دیکھلو کہ وہ اپنے اثر کے اعتبار سے یا مفید ہوتے ہیں یا مضر تو اب ایسی کوئی قسم نہ رہی جو نہ مفید ہو نہ مضر پس مباحات کو تیسری قسم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے یا محمود یا مذموم تو اب دو ہی قسم کے افعال ہوئے ایک وہ جو معین آخرت ہیں دوسرے وہ جو مضر آخرت ہیں اسکے بعد پھر ایک مراقبہ کی تعلیم کیگئی القا کے طور پر تو جی چاہا کہ اپنے بھائیوں کو بھی بتلا دیا جائے۔ اُسوقت جو حالت میرے اوپر غالب تھی ویسی تو اب نہیں رہی مگر خدا تعالیٰ کی ناشکری کیوں کروں بحمد اللہ اب بھی بہت بڑا اثر قلب پر ہے وہ مراقبہ یہ ہے کہ ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں (یا کرنے والے ہیں) یہ آخرت میں مضر ہے یا مفید ہے۔ اس مراقبہ کیلئے کوئی وقت معین نہیں بلکہ یہ ایسا مراقبہ ہے کہ ہر وقت اسکا وقت ہے چلتے پھرتے بھی اسکو سوچتے رہو اور کھاتے پیتے بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی اور رنج و غصہ میں بھی کوئی حرکت اور کوئی سکون اس مراقبہ سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ اسکے بعد پھر آپ سے انشاء اللہ اول تو گناہ صادر ہی نہ ہوگا اور اگر بالفرض صادر ہوا بھی تو آپ اُسوقت بیدار گنہگار ہونگے سرکش و غافل گنہگار نہ ہونگے اور یہ بھی ایک بڑی دولت ہے کہ انسان کو گناہ کے وقت تنبہ ہو جائے کہ میں نے یہ کام گناہ کا کیا اس سے دل پر ایک ایسا چرکہ لگتا ہے جسکے بعد معاً توبہ و استغفار کو دل چاہتا ہے شاید یہاں کوئی ذہین بیٹھے ہوں اور وہ اپنے دل میں یوں کہتے ہوں کہ یہ تو اور بھی برا ہوا کہ جانکر گناہ کیا تو اسوقت یہ شخص ویل للجاهل مرة وللعالم سبعين مرة کا مصداق ہو جائیگا تو بات یہ ہے کہ جانکر گناہ کرنا یہ کس نے کہا ہے کہ مطلقاً اشد ہے بلکہ علم کی ساتھ وہ گناہ اشد ہے جسکی ساتھ جرأت بھی ہو ورنہ اگر جرأت نہ ہو تو جانکر گناہ کرنا غفلت کے گناہ سے اشد نہیں اور اس مراقبہ کے ساتھ جرأت تو کبھی ہو سکتی ہی نہیں تو اب یہ شخص بیدار گناہگار ہوگا کہ معصیت کو معصیت جانیگا غافل نہ ہوگا کہ یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں نے کوئی گناہ کا بھی کام کیا ہے یا نہیں اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معصیت کے ساتھ خشیت بھی ملی ہوئی ہوگی اور حضرت خشیت اور معصیت اگر دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو گو وہ خشیت کامل نہ ہوگی مگر

اسکی ساتھ معصیت بھی کامل نہ رہے گی یہ خشیت ایسی چیز ہے کہ معصیت اسکی ساتھ کامل نہیں ہو سکتی اگر کامل خشیت ہے جب تو گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا اور اگر ناقص خشیت ہے تو اُسکی وجہ سے معصیت بھی ناقص ہو جاتی ہے اسکی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا دو تو گو اس سے وہ ٹھنڈا نہ ہو جائیگا مگر ویسا گرم بھی نہ رہے گا تو خشیت کے ساتھ معصیت کی یہ کیفیت ہو گی کہ اُسوقت آپ اگر غیبت بھی کریں گے تو دلکو حظ حاصل نہو گا زبان سے غیبت کریں گے اور دل میں جوتے پڑتے ہوں گے کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا تو یہ تھوڑا نفع ہے اس مراقبہ کا اسلیے میں یہ نہیں کہتا کہ اس مراقبہ کے بعد آپ سے گناہ کا صدور ہی نہو گا بلکہ اسکی ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر صدور ہو گا تو خشیت کیساتھ ہو گا اور اس مضمون کے اظہار میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر کسی کو تجربہ ہوا ہو کہ خشیت کے ساتھ بھی گناہ ہو جاتا ہے اور وہ اُسوقت مولویوں کو جھوٹا کہتا ہو کہ یہ مولوی بھی بے پر کی باتیں اڑایا کرتے ہیں کہ خشیت وخوف دل میں پیدا ہو جانے سے گناہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ ہمنے تو آیات وعید و احادیث عقاب کا بہت مطالعہ کیا اور اُن سے خوف بھی پیدا ہوا مگر پھر بھی گناہ موقوف نہیں ہوتے تو وہ اس مضمون کو سُنکر مولویوں کو جھوٹا نہ کہیں گے کیونکہ جیسا اُن کو خشیت کے ساتھ گناہ صادر ہونیکا تجربہ ہوا ہو گا اسکی ساتھ یہ بھی تجربہ ہوا ہو گا کہ گناہ کے وقت دل میں ایک خلش بھی ساتھ ساتھ موجود تھی جس نے معصیت کو بھی ضعیف بنا کر گناہ بے لذت میں داخل کر دیا تھا تو صاحب جیسی خشیت آپ کو حاصل ہوئی تھی ویسا ہی اُس نے اثر بھی کیا وہ بیکار تو نہوئی پھر اب مولویوں کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں بات یہ ہے کہ خشیت کے تین درجے ہیں ایک خشیت اعتقادی یہ تو ہر مسلمان کو حاصل ہے کیونکہ ایمان نام ہی ہے خوف ورجا کا پس اس درجہ سے تو کوئی مسلمان خالی نہیں مگر اعتقادی خشیت گناہوں سے روکنے میں کافی نہیں بلکہ اسکی ساتھ استحضار خشیت کی بھی ضرورت ہے یہ دوسری قسم ہے پھر استحضار کے دو درجے ہیں ایک استحضار کامل دوسرے استحضار ناقص استحضار کامل کے ساتھ معصیت ہرگز نہیں ہو سکتی مگر ہم لوگوں کو استحضار کامل حاصل نہیں اور اسی کی ضرورت ہے لیکن استحضار کامل ایک دو دن میں حاصل نہیں ہوا کرتا اسکے لئے مشق کی ضرورت ہے پہلے آپ استحضار

ناقص ہی کیجئے اس سے گو معصیت کا انعدام نہ ہوگا مگر تقلیل ضرور ہو جائے گی اور وہی کیفیت ہو گی جو میں نے ابھی بیان کی ہے کہ خشیت ناقصہ کے ساتھ معصیت بھی ناقص ہی ہوگی اور معاً توبہ و استغفار کی توفیق ہو گی وہ حالت نہ رہے گی جو پہلے تھی کہ گناہ کرکے دل پر جوں بھی نہ رینگتی تھی پھر اسی حالت پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ استحضار ناقص سے استحضار کامل کی طرف ترقی کیجئے انشاء اللہ شدہ شدہ آپ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے یہ میں نے اسلئے کہا کہ شاید کوئی شخص اس مراقبہ پر عمل کرے اور ترک معاصی میں پوری کامیابی نہ ہو تو مایوس ہو جائے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ان حضرات کو سمجھ لینا چاہئے کہ دو چار روز کی مشق سے استادِ مشاق نہیں بنا کرتے بلکہ اُستاد بننے کیلئے عرصہ تک مشق کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے خوشنویسی حاصل تو ہو جاتی ہے چند روز کی کوشش سے مگر اُستاد بننے کیلئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے اسی طرح قرآن حفظ کر لینا تو چند روز کا کام ہے مگر اُس کا قابو میں آجانا ایک مدت چاہتا ہے پھر ان کاموں میں کمال حاصل کرنیکا طریقہ کیا ہے سبکو معلوم ہے کہ کام میں لگا رہنا اور مشق کا جاری رکھنا ہی اس کا طریقہ ہے پس یہی طریق عمل اس مراقبہ میں بھی جاری رکھئے چند روز میں کامیابی نہ ہو تو گھبراؤ نہیں نا امید نہ ہو ؎ نا امیدی را خدا گردن زدہ است۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

اور ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

یعنی یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے لگے رہو کوشش کرتے رہو انشاء اللہ ایک دن کامیاب ہوگے اور یہ حال ہوگا ؎

تادم آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

اور یہ حال ہوگا ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور　　کلبۂ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور

انشاء اللہ ایک دن یہ غم ختم ہو جائے گا اور کامیابی سے دل مسرور ہو گا (رزقنا اللہ

تعالیٰ وایاکم الوصول الیہ آمین ۱۲ جامع) میں دعویٰ سے نہیں کہتا خدا کے بھروسہ
پر کہتا ہوں کہ اس مراقبہ کو جاری رکھو انشاء اللہ ایک دن ضرور کامیاب ہوگے (والذین
جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وعدہ الٰہی ہے ۱۲ جامع) بس ہر کام پر اس حیثیت سے
نظر کرو کہ یہ معین فی المقصود ہے یا مضر پھر جو معین ہو اُسکو اختیار کرو اور جو مضر ہو اُسکو ترک
کردو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جو بات میرے دل میں ہے وہ سامعین کے دل میں ڈالدوں
مگر کیونکر ڈالدوں یہ میرے اختیار سے باہر ہے اور الفاظ اسکے لئے کافی نہیں اور یہ اُن لوگوں
کے اعتبار سے کہتا ہوں جنکے دل میں یہ وارد پہلے سے نہو اور جو پہلے سے اس کا ذوق رکھتے
ہیں وہ تو اشارہ ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر جو بات دل میں نہ پہونچائی جاسکے کم از کم اسکو
کانوں میں تو ڈالدیا جاوے شاید کسی وقت ذوق حاصل ہو تو یہ کان میں پڑی ہوئی بات کام
آئے گی اور چونکہ طویل مضمون یاد نہیں رہا کرتا اسلئے میں خلاصہ بیان کرتا ہوں کہ بس ہر کام
سے پہلے اتنا سوچ لیا کرو کہ یہ نجات آخرت میں معین ہے یا نجات سے مانع ہے اور اس کا
استحضار ہر کام میں رکھو خواہ مباح ہو یا فرض و واجب یا اور کچھ۔ اور اسی غرض کیلئے میں نے
اس وعظ کا نام (الاسعاد والابعاد) تجویز کیا ہے اسعاد کے معنی ہیں اعانت و ابعاد
کے معنی ہیں تنحیہ یعنی دور کرنا کذا فی القاموس) تو یہ نام آپ کو اس مراقبہ کی یاددہانی کرے گا
کیونکہ وہ مراقبہ بھی اسی بات کا ہے کہ کونسا کام مقصود آخرت میں معین ہے اور کونسا مقصود
سے دور کرنیوالا ہے تو اب آپ کو لمبا مضمون یاد کرنا نہ پڑے گا بلکہ محض اس وعظ کا نام
تصور معانی کے ساتھ اس مراقبہ کی یاددہانی میں کافی ہو جاوے گا اور یہ محض دو لفظ ہیں
جنکا یاد کرنا دشوار نہیں یہ تجربہ ہے کہ الفاظ مختصرہ سے بڑے بڑے مضامین مستحضر ہو جاتے ہیں
میں نے تو مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حل کئے ہیں مجھے ابتدا سے
اختصار محبوب ہے کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے جسکا سبب میری کاہلی بھی
ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے طول طویل کاموں کی ہمت نہیں خیر کچھ ہی سبب ہو باقی یہ تجربہ بالکل صحیح
ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں اور میں نے تو اس سے بہت
ہی کام لیا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں میں جلالین پڑھتا تھا تو اسوقت میں نے یہ چاہا کہ جلالین کے

جو دو حصے دو مصنفوں کے ہیں اسکو یاد رکھوں کہ پہلا کس کا ہے اور دوسرا کس کا کیونکہ جلالین ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سورہ کہف سے اخیر تک جلال الدین محلی رحمۃ اللہ کی تصنیف ہے اور انھوں نے اول حصہ کی بھی تفسیر شروع کی تھی چنانچہ سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھ بھی چکے تھے کہ عمر نے وفا نکی اور انتقال ہوگیا تو سورہ بقرہ سے سورہ اسرا تک علامہ جلال الدین سیوطی نے تکمل کی چونکہ دونوں کا نام جلال الدین ہے اسلئے یہ یاد نہ رہتا تھا کہ پہلا حصہ کس کا ہے اور دوسرا کس کا تو میں نے دونوں کے لقب سے اول حرف لیلیا چنانچہ سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے شروع میں میم ہے اور سین حروف ہجا میں میم سے مقدم ہے تو میں نے یہ جملہ یاد کر لیا الاول للاول والآخر للآخر یعنی پہلا حصہ اسکا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب ہجا میں مقدم ہے اور دوسرا اس کا ہے جسکے لقب کا پہلا حرف ترتیب میں مؤخر ہے اس طریقہ سے یہ مضمون ہمیشہ یاد رہا اسی طرح حدیث معراج میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آسمان میں خاص خاص انبیاء سے ملاقات کی ہے اور اسکی ترتیب بھی احادیث میں مذکور ہے کہ پہلے آسمان میں آپنے آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور دوسرے میں حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات کی اور تیسرے میں یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے میں ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں میں ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے میں موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔ مگر یہ ترتیب یاد نہ رہتی تھی تو میں نے اسکے یاد کرنیکے لئے ایک مختصر لفظ بنا لیا یعنی اعیاهم جسمیں ہمزہ آدم علیہ السلام کیلئے اور عین عیسیٰ علیہ السلام کیلئے ہے اسی طرح ہر نبی کے نام میں جو حرف اول تھا وہ اس جملہ میں لیلیا گیا ہے اور ہر ایک سے ملاقات کی ترتیب وہی ہے جو ترتیب حروف کی اس جملہ میں ہے مگر اسمیں دو باتیں قابل تنبیہ ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا کوئی حرف اس میں نہ آسکا اس جملہ میں صرف چھ حرف ہیں جس سے چھٹے آسمان تک کی ترتیب معلوم ہو سکتی ہے ساتواں حرف ایک اور ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کی ترتیب پر بھی دلالت ہو جاتی اور اسکے لئے صرف یہ ممکن تھا کہ آخر میں الف بڑھا کر اسکو اعیاهما کر دیا جاتا مگر اسکے معنی کچھ موزوں نہ ہوئے کیونکہ اعیاهم کے

معنی تو یہ ہیں کہ حضور نے سب انبیاء کو سبقت سے عاجز کر دیا اور یہ ایک عمدہ معنی ہیں اور اعیاھما میں ضمیر تثنیہ لانے سے یہ معنی ہوتے کہ آپ نے دو کو عاجز کر دیا سو یہ معنی کچھ موزوں معلوم ہوئے کیونکہ اسمیں دو کی تخصیص بلا وجہ کرنی پڑتی ہے۔ سو اتنی بات خود یاد رکھ لی جائے کہ اسمیں ساتویں نبی کا نام مذکور نہیں جنسے ساتویں آسمان پر ملاقات ہوئی تھی اور یہ بھی یاد رکھ لیا جائے کہ ان کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھ لی جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یحییٰ علیہ السلام بھی ہیں کہ وہ بھی دوسرے ہی آسمان پر ہیں اُن کے لئے کوئی لفظ مستقل نہ آسکا اور اس جملہ میں جو تیسرا حرف یا آرہا ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نام کی علامت ہے جو ترتیب میں تیسرا حرف ہے اور وہ تیسرے ہی آسمان پر ہیں سو حرف عین سے ایک نبی کی طرف اشارہ ہو گیا اور دوسرے کو زبانی یاد رکھا اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فلک چہارم پر ہیں یہ غلط ہے نہ معلوم یہ کس طرح بے اصل مشہور ہو گیا زیادہ تر یہ بات شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے جنمیں بعض وہ شعراء بھی ہیں جو محقق ہیں مگر انھوں نے اس غلطی میں عوام کا اتباع کر لیا ہے اسلئے ہمیں اُن کے کلام میں تاویل کی ضرورت نہیں بلکہ صاف بات یہ ہے کہ بعض دفعہ شاعری میں محقق بھی مذاق عوام کی رعایت کر کے غیر محقق بات استعمال کر لیتا ہے مگر بحر العلوم نے انکی رعایت کر کے یہ تاویل کی ہے کہ فلک چہارم سے آسمان چہارم مراد نہیں بلکہ کرہ چہارم مراد ہے اور آسمان دوم عدد کرات علویہ میں چوتھے نمبر پر ہے کیونکہ اُس سے نیچے آسمان اول ہے اور اسکے نیچے کرۃ النار ہے اور اسکے نیچے کرۃ الہوا ہے اس طرح آسمان دوم چوتھا کرہ ہوا اسپر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہوا کے نیچے کرۃ الماء اور اسکے نیچے کرۃ الارض بھی تو ہے اس کا یہ جواب دیا جائیگا کہ یہ کرات سفلیہ ہیں اور گفتگو کرات علویہ میں ہے اسلئے ان دونوں سے نقض وارد نہیں ہوتا۔ دوسرے متکلم خود دو کرہ کے اوپر ہے اور اسکے اوپر صرف عناصر کے دو ہی کرے ہیں ہوا و نار۔ خیر کسی کو یہ تاویل پسند ہو تو وہ یہ تاویل کر کے مولانا رومی وغیرہ کے کلام کو درست کر لے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان چہارم پر مانا ہے بعض شعراء تو ایسا غضب کرتے ہیں کہ ایک شاعر نے عیسیٰ علیہ السلام کو فلک چہارم پر مانکر انھیں بیمار بھی مانا ہے کہتا ہے ؎

برآسمان چہارم مسیح بیمار است　　تبسم تو برائے علاج درکار است

یعنی وہ اپنے معشوق حرمی سے کہتا ہے کہ آسمان چہارم پر مسیح بیمار ہیں۔ بھلا مسیح اور بیمار۔ وہ تو مردوں کو زندہ کرتے اور اندھوں کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے وہ بیمار ہوں گے اور خیر زمین پر رہتے ہوئے تو بیمار ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا یہ تو انکو آسمان پر بیمار مانتا ہے بھلا وہاں بیماری کا کیا گذر۔ جب وہاں عیسیٰ علیہ السلام نہ زمین کی غذائیں کھاتے ہیں نہ وہاں انکو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے نہ وہاں کسی قسم کا تعفن ہے تو وہاں بیمار ہونا کیسا۔ پھر بیماری کا علاج بھی ان کے معشوق حرمی کا تبسم ہی میسر ہوا۔ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ ایک نبی کا علاج اپنے محبوب کے تبسم کو بتلاتا ہے مگر شعراء کو اسکی کچھ پروا نہیں بس انھیں تو یہ چاہیئے کہ شعر بنجائے چاہے عقل و شعور پر اس سے پردہ ہی پڑجائے اور غضب یہ کہ اس مرض میں بعض عارفین بھی مبتلا ہیں وہ کسی معشوق حرمی کے مقابلہ میں تو انبیاء کی توہین نہیں کرتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بعض دفعہ ایسی باتیں کہجاتے ہیں جنسے دوسرے انبیاء کی توہین ہوجاتی ہے چنانچہ جامی فرماتے ہیں ؎

غلامے بود یوسف زرخریدہ ؎

خدا معاف کرے ان حضرات کو میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے اس معنی کے تصور سے بھی بھلا یوسف علیہ السلام کو غلام کہنا اور زرخریدہ کہنا کیا یہ تھوڑی بات ہے۔ بہت سخت بات ہے مگر شعراء اسکی پروا نہیں کرتے۔ میں ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ انبیاء کی شان میں کونسی بات کہنے کی ہے اور کونسی بات کہنے کی نہیں وہ یہ کہ یہ تصور کرلیا جائے کہ اگر کسی مجمع میں وہ نبی موجود ہوں جنکی شان میں ہمنے یہ بات کہی ہے تو کیا اس مجمع میں ان کے سامنے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں یا کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے بھائیوں کے متعلق ہم یہ مضمون پڑھ سکتے ہیں بس جو بات ایسی ہو جسکے متعلق دل گواہی دے کہ اسکو ہم ان پیغمبر کے سامنے کہہ سکتے ہیں وہ تو کہو اور جسمیں کھٹکا پیدا ہو کہ سامنے یہ بات نہیں کہسکتے اسکو اپنے کلام میں سے نکالدینا چاہیئے۔ یہ بہت بڑا معیار میں نے آپ کے ہاتھ میں دیدیا ہے اسکو مستحضر رکھکر شعراء اپنے

کلام میں اصلاح کر سکتے ہیں الغرض میں نے لفظ اعبا ھم سے اُس ترتیب کو یاد کیا تھا
جس ترتیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حضرات انبیاء سے آسمانوں پر
ملاقات فرمائی ہے تو میں نے مختصر الفاظ سے بہت کام لیا ہے اسی بناء پر میں نے اس وعظ
کا نام ایسا تجویز کیا جو اختصار کے ساتھ آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا میں نے بہت
دیر میں اس بات کو کہا جو مجھے اسوقت کہنا تھی اور بات بھی مختصر ہی تھی جسکے لئے اتنی دیر
کی ضرورت نہ تھی نہ اتنی دیر کی نیت تھی مگر خود بخود دیر ہوگئی لیکن حرج ہی کیا ہے یہ وہ باتیں
نہیں ہیں جنکے زیادہ ہونے سے ہیضہ ہو جب ماکولات میں بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جنکے
زیادہ کھانے سے ہیضہ نہیں ہوتا جیسے خربوزہ کو لوگ بتلاتے ہیں تو کیا معقولات میں ایسا
ہونا کچھ دشوار ہے۔ اب میں اس مضمون کا انطباق آیت متلوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں
حق تعالیٰ فرماتے ہیں وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ۔ یہ معنیً معطوف ہے
تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم پر جو قل کے تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قل تعالوا الخ
وقل ان ھذا صراطی مستقیما الخ اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جگہ اِن مکسورہ ہوتا
کیونکہ قول کے تحت میں اِن مکسورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قرأت میں مکسورہ ہے بھی مگر
ہماری قرأت میں اَنّ مفتوحہ ہے جسکی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قرأت میں یہاں
اُخبِر مقدر ہے جسکے ملانیکے بعد لفظاً یہ قل کے اوپر معطوف ہے اسلئے منصوب ہو گیا
گو معنیً تعالوا پر عطف ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے
سیدھا اس کا اتباع کرو۔ ھذا سے مذکور سابق کی طرف اشارہ ہے اوپر تقریباً دس احکام
اوامر و نواہی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم
الا تشرکوا به شیئا و بالوالدین احسانا ج ولا تقتلوا اولادکم من املاق ط نحن
نرزقکم و ایاھم ج ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن ج ولا تقتلوا النفس
التی حرم اللہ الا بالحق ط ذلکم وصکم بہ لعلکم تعقلون ہ ولا تقربوا مال الیتیم
الا بالتی ھی احسن حتی یبلغ اشدہ ج واوفوا الکیل والمیزان بالقسط ج لا نکلف
نفسا الا وسعھا ج واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی ج وبعھد اللہ اوفوا

ذٰلکم وصّٰکم بہ لعلکم تذکرون ○ وان ھٰذا صراطی مستقیما الی آخرہ - ترجمہ یہ ہے
کہ آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تمکو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جنکو تمہارے رب نے تم پر
حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ
(پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس
اُن سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت
کیا کرو (زمانہ جاہلیت میں اسکی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کر دیتے تھے) (کیونکہ ہم
تمکو اور اُن کو (دونوں کو) رزق (مقدر) دینگے (وہ تمھارے رزق مقدر میں شریک نہیں میں
پھر کیوں قتل کرتے ہو پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بیحیائی (یعنی بدکاری) کے
جتنے طریقے ہیں اُن کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ
اور (پانچویں یہ کہ) جسکا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اسکو قتل مت کرو ہاں مگر
حق (شرعی) پر (قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب)
کا تمکو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم
کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اُسمیں تصرف نکرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہی)
جو (شرعاً) مستحسن ہے (مثلاً اسکے کام میں لگانا اُسکی حفاظت کرنا اور بعض اولیا و اوصیا کو
اُسمیں یتیم کیلئے تجارت کرنیکی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے) یہانتک کہ وہ
اپنے سن بلوغ کو پہونچ جاوے (اسکے بعد اس کا مال اُسکو دیدیا جائے گا بشرطیکہ سفیہ یعنی
بیوقوف نہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور (ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول
پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ آوے پس اُسمیں
دغا کرنا حرام ہوا اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ احکام کچھ دشوار نہیں جنپر عمل دشوار ہو کیونکہ) ہم (تو)
کسی شخص کو اُسکے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی
کی کیا وجہ) اور (آٹھویں یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق) کوئی بات
کیا کرو تو (اُسمیں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جسکے مقابلہ میں وہ بات
کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے

جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا نذر) اسکو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر وقسم خلاف شرع نہو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) اسکے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس گو هٰذا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم ہے یعنی وہ دین جسکے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں اور نہ حضور کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص پس هٰذا کے بعد صراطی فرمانا خود تعمیم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس صراط کا دیگر احکام پر مشتمل ہونا سبکو معلوم ہے خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں سے یہ بھی کہدیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جنمیں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس هٰذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن میں اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام تسعہ مذکورہ کے ذکر کے بعد هٰذا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرات و عبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب محکم ہیں جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر اَنَّ هٰذا صراطی میں صراحۃً تعمیم کردی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہوگئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ یہاں حضور کو حکم ہو رہا ہے کہ لوگوں سے کہدیجئے کہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت معنیً تعالوا پر معطوف ہے جو قل کے تحت میں ہے اور لفظاً یہاں اخبر محذوف ہے پس خطاب قل واخبر کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہو سکتا ہے اور قائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اسکی نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہا گیا ہے قل هٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ

علی بصیرۃ انا و من اتبعنی - اور اسلام کو حضور کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے انک لتھدی الی صراط مستقیم صراط اللہ الذی لہ ما فی السموات وما فی الارض - اسپر یہ سوال وارد ہوگا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہ فرمایا بعض جگہ مجازاً اسکو صراط رسول اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللہ کیوں فرمایا تو جواب اسکا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور کی طرف اس صراط کو اسلیے مضاف کردیا گیا تاکہ سامعین کو اسپر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اسپر چلو تو لوگ یہ سنکر گھبرا جاتے کیونکہ خدا تعالی کی ذات تک ذہن کی رسائی اول تو دشوار ہے اُن کی تو شان یہ ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — و ز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

خدا تعالی کی ذات تک وہم بھی نہیں پہونچ سکتا جو کچھ اسکے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالی اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات او را گنج کو — تا در آید در تصور مثل او

یہ لفظ سارے نسخوں میں کنج ہے - مثنوی کو جس کنج (اور جس گوشہ) سے نکالوگے سب میں یہی نکلے گا کسی کے پاس اسکی کنجی نہ تھی صرف حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس اسکی کنجی تھی حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا حضرت نے مکہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو کنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اسکے معنی بناتے تھے وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے مگر کوئی بات نہ بنتی تھی حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے معنی گنجایش کے بس اسکو سنکر وہ شیخ پھڑک ہی تو گئے اب شعر کے معنی بے تکلف ظاہر ہوگئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالی کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجایش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجایش نہیں حق تعالی کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے جسکی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے جب حق تعالی کی ذات

تک کسی کی رسائی نہیں تو اگر ابتداء ہی اسلام کو صراط اللہ کہدیا جاتا یعنی حق تعالیٰ کی طرف اسکی نسبت کیجاتی تو لوگ گھبرا جاتے اور اس سوچ میں پڑجاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں بس اسی طرح اُن کا رستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا اس لئے پہلے اُس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہدیجئے کہ یہ تو میرا رستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور تک سبکی رسائی ممکن ہے آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اسلئے یہ سنکر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ کا راستہ ہے اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہو گا بلکہ نزدیک ہوگا یہ فائدہ ہوا آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا نزدیک و سہل ہونا معلوم ہو گیا پھر جب حضور تک رسائی ہو گئی اور اُس راستہ پر چلنا شروع کیا اب حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھکر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اسکے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور نے اس راستہ کو طے کر لیا ہے معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اسکو طے کر سکتے ہیں خصوصاً جبکہ حضور (جو واقف طریق ہیں) ہمارے معین و رفیق ہیں۔ واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے جسکو وہی طے کر سکتا ہے جسکو حق تعالےٰ طے کرانا چاہیں۔ اسی لئے سالک کو جب اسپر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اُسوقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے اور اُسکے طول دلاتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست — آنجا جز اینکہ جان بسپارند چارہ نیست

اور جب اسپر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جسپر آپ چل رہے ہیں تو اُسکی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے ؎

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من — پیادہ مے روم وہمرہاں سوارانند

اور حضور کی اعانت و رفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے یہ تو اُن لوگوں کیلئے

ہے جنکی رسائی حضور تک ہو چکی ہے اور جو حضور تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں انکو اسکی ضرورت ہے کہ اُن مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور تک رسائی حاصل کر چکے ہیں (جیسے بادشاہ تک پہونچنے کیلئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے مگر جو وزیر تک بھی نہ پہونچا ہو اُسکو چاہیئے کہ اُن لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں ۱۲ جامع) شیخ فرید فرماتے ہیں ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق
گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر و پس بر آ

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

قلاؤز سے مراد قل اعوذ یا مولوی نہیں بلکہ قلاؤز کہتے ہیں رہنما کو یہ ترکی لغت ہے گو وہ قلاؤز ہوگا قل اعوذ یا ہی مطلب یہ ہے کہ اس راستہ کو رہنما کے بغیر طے نکرو ورنہ بہت پریشان ہوگے اور راستہ طے نہ ہو سکے گا آگے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید　　ہم بعون ہمتِ مردان رسید

اسمیں جواب ہے اس سوال کا کہ ہم تو بعض اولیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ بدون رہنما کے واصل ہو گئے ظاہر میں اُن کا کوئی شیخ نتھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے والنادر کالمعدوم اسلئے نوادر سے نقض وارد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جسکو تم ظاہر میں بدون کسی رہنما کے واصل دیکھتے ہو وہ حقیقت میں ایسا نہیں واقع میں وہ بھی کسی رہنما کے واسطہ سے واصل ہوا ہے گو ظاہر میں اُس کا کوئی شیخ نہیں مگر وصول اُسکو بھی عونِ ہمتِ مردانِ طریق سے ہوا ہے یعنی اہل اللہ میں سے کسی نے اُسپر نظر کی ہے جسکی برکت سے وہ واصل ہو گیا ہے گو اس شخص کو اسکی خبر بھی نہو کہ مجھپر کس نے نظر کی ہے حضرات اہل اللہ کے احسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ بہت لوگوں کو اُن کے احسان کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ اُن کے لئے دعائیں کرتے کرتے تھک گئے ہیں حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ کا واقعہ ہے کہ آپکے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جنسے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت مجدد صاحب کو اُن کی بابت مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہو گا پس حضرت مجدد صاحب دیکھکر

تڑپ ہی تو گئے آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے آپ نے اُسکے لئے دعا کرنا چاہی مگر ڈر ہے کہ اسمیں حضرت حق کی مزاحمت نہو کہ تقدیر مکشوف ہونیکے بعد اُسکے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہکر میں شقی کو سعید کرا سکتا ہوں اسپر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلافِ ادب نہیں چنانچہ پھر تو آپنے اُسکے لئے بہت دعائیں کی اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے حتیٰ کہ آپ کو مکشوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اُسکو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا مگر اُس شخص کو خبر بھی نہ تھی اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہے راتوں کی نیند اُسکی اڑ گئی ہے۔ خیر یہ واقعہ تو ہو گیا مگر اسپر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جسکے متعلق ارشاد ہے مایبدل القول لدیّ۔ حضرت مجدد صاحب نے اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقع میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی ہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہو گا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ ایک قید تھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اسکے لئے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ تقدیر اصل میں علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں کیونکہ اسمیں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس در اصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے کیونکہ لوح محفوظ میں اُتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو و الاثبات میں ہوتا رہتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اسمیں ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجہ میں ہے اسمیں اس کا اصلا احتمال نہیں پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے۔ اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونیکی دلیل نص سے

نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم یعنی قرآن ہمسے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے یہ غایت قرب لدیّ کا مدلول ہے اور غایت قرب ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اسی لئے اُسکو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی حکیم دونوں کی دلالت اُسکے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس کے قبل جو ارشاد ہوا ہے انا جعلناہ قرآنا عربیا۔ اسمیں اُسکا جعل کا مفعول ہونا اور عربیۃ کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اسی سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہوگیا۔ خیر یہ تو بیچ میں ایک علمی لطیفہ تھا مقصود میرا یہ تھا کہ اہل اللہ بعض دفعہ اس طریقہ سے بعض لوگوں پر احسان فرماتے ہیں کہ اُن کو خبر نہیں ہوتی بھلا اگر مجدد صاحب بیان نفرماتے تو اُن بزرگ کو اس احسان کی اطلاع کیسے ہوتی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ حضرت مجدد صاحب کے معتقد ہونگے اگر معتقد نہوتے تو اس احسان کو تسلیم کرنیکے بجائے مجدد صاحب پر معلوم کیا کیا اعتراض کرتے یہ ہے ہم بعون ہمت مردان رسید۔ اور یہ بھی اُن بزرگ کی سعادت کی علامت تھی کہ انھوں نے مجدد صاحب پر اعتراض نہیں کیا بلکہ تسلیم سے کام لیا ان حضرات پر انکار نکرنا بھی بڑی دولت ہے اہل اللہ کے ساتھ انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھکر انکار نکرو کیونکہ کیا خبر ہے کہ خدا کے یہاں کون عزیز ہے اور کون حقیر بعض دفعہ جنکو ہم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں خدا کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی تربیت و تعلیم بھی نکرو کیونکہ تعلیم میں تحقیر و بے ادبی نہیں بلکہ تعلیم تو ادب ہی ہے کیونکہ ہر چیز کا ادب اُسکے مناسب ہوتا ہے چھوٹوں کا ادب یہی ہے کہ اُن کی تربیت و تعلیم کی جائے۔ یہاں تک تو لفظ صراط کے متعلق بیان تھا آگے فرماتے ہیں مستقیما یعنی یہ راستہ مستقیم ہے۔ لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی اقصر الخطوط الواصلۃ بین النقطتین (دو نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہوسکیں اُن میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے اور

ایک معنی عرفی ہیں یعنی بخوف وخطر راستہ۔ عرف میں رہِ راست اُس راستہ کو کہتے ہیں جسمیں کوئی خطرہ نہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گانوں کا سیدھا راستہ یہ ہے اسکو چلے جاؤ حالانکہ اُسمیں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بیخطر ہے اسمیں تمکو غلطی پیش نہ آئے گی صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہیں ؎ رہ راست برو اگرچہ دورست - اگر رہ راست کے معنی عرفی نہ لئے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دور راست نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغۃً مستقیم ہوگا وہ اوروں سے دور کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اُسکے لئے اقصر الطرق ہونا لازم ہے جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بیخطر راستہ کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراط حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صراط حق بیخطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب و اقصر بھی ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عرفی پر (یا دونوں پر ۱۲) یہاں سبکی گنجایش ہے اسکے بعد ارشاد ہے ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ یعنی اس راستہ (اسلام) کا اتباع کرو اور دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نکرو ورنہ وہ تمکو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کر دینگے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں نقطۂ مقصودہ سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً فوقتاً بعد ہی بڑھتا جاتا ہے۔ جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بیخطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنیکا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہو جاتا ہے اور ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے تو صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے جس میں اس راستہ کی اضافت حضورؐ کی طرف تھی اور یہاں عن سبیلہ بضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاء متکلم فرماتے سو اسکی توجیہ کی اسلئے کوئی ضرورت

نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت تو صراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کر چکا ہوں اسکے بعد ارشاد ہے ذٰلکم وصّٰکم بہٖ لعلکم تتقون اسکی خدا تعالیٰ نے تمکو وصیت فرمائی ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کر سکو۔ وصیّت کرنے سے مراد تاکیدی حکم دینا ہے کیونکہ وصیّت اصل میں اُس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنیکے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اسلئے اسوقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جنکی تعمیل کو وہ بہت مؤکد و لازم کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم و فناء سے پاک ہیں اسلئے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہو نہیں سکتے بلکہ اُس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکیدی لعلکم تتقون یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تمکو وصال مقصود حاصل ہو جائیگا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہو جاؤگے کیونکہ تقویٰ کے معنی لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہوگے اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد نصوص میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تمکو کمال دین حاصل ہو جائیگا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہونچنے اور منزل پر وصول ہو جانیکا۔ اسکے بعد میں اس آیت کو مضمون مقصود پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تبرعاً اسکو بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ پوری تسلی ہو جائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے۔ سو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ھٰذا صراطی سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام گو نام لغۃً ہے مجموعۂ اعمال کا اور عقائد اسمیں مجازاً داخل ہیں اور حقیقۃً عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعلِ جوارح اور یہ اطلاق لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنی لغۃً تصدیق کے ہیں جو اولاً و بالذات قلب سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معنی گردن نہادن باطاعت کے ہیں جسکا محل جوارح ہیں اور بعض نصوص میں بھی اسلام و ایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا و لکن قولوا اسلمنا۔ لیکن یہ حقیقت

لغو یہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے مجموعۂ عقائد و اعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعۂ عقائد کا تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور یہاں پر ھذا صراطی سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اُس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد و اعمال سبکو شامل ہے جسکا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قل تعالوا میں عقائد و اعمال دونوں کا ذکر ہے اُسکے بعد وان ھذا صراطی مستقیماً فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعۂ عقائد و اعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال و عقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال و عقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمثیل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول و فروع کو شامل ہے البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہوگی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لا تشرکوا و لا تقتلوا و لا تقربوا اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے بالوالدین احساناً۔ واوفوا الکیل واذا قلتم فاعدلوا اور ان سبکو صراطی فرمایا اور اُسکے اتباع کا امر فرمایا تو صراط کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اور اتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض ھذا صراطی سے مراد تمام وہ اعمال و مامورات ہیں جو معین آخرت و مفید بمقصود ہیں جنکا مفید ہونا مستقیماً میں مدلول ہے کہ استقامت کیلئے موصل الی المقصود ہونا لازم ہے اور و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ میں تمام وہ اعمال آگئے جو مانع عن الآخرت و مضر للمقصود ہیں اور مضر ہونا فتفرق سے ظاہر ہے پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ ہمکو ہر کام میں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اسمیں تمام شریعت آگئی کوئی مضمون شریعت کا اس سے خارج نہیں رہا۔ اسلئے اس آیت کے تحت میں تمام شریعت کا ذکر ہو سکتا ہے اسی واسطے میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ اس آیت کی تفصیل عمر بھر میں بھی بیان نہیں ہو سکتی اور وہ ایک شخص کی عمر نہیں بلکہ ایک جماعت کی عمر جو فی نفسہ گو متناہی ہو مگر بمعنی لا تقف عند حد غیر متناہی ہو پس اسمیں وہ احکام بھی داخل ہیں جو اس ماہ رواں یعنی شعبان کے متعلق یا ماہ آئندہ رمضان کے متعلق شریعت میں وارد ہیں لہذا میں احکام شعبان کو بھی اس کے تحت میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور رمضان کے متعلق اگر موقعہ ملا تو پھر کبھی بیان ہو جائیگا۔ شعبان کی بابت حدیث میں یہ خاص فضیلت مذکور ہے اذا

كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها فان الله تبارك وتعالىٰ ينزل فيها لغروب الشمس الى السماء الدنيا فيقول الا من مستغفر فاغفر له الا من مسترزق فارزقه الا من مبتلى فاعافيه الا كذا الا كذا حتى يطلع الفجر رواه ابن ماجه وسنده ضعيف كما يدل عليه تصدير المنذري اياه بلفظ روي وهو علامة الضعف كما صرح به في خطبة كتابه اھ ترغیب ص ۱۷۹ ج ا لكنه يتحمل في فضائل الاعمال جامع) یعنی حق تعالیٰ اس مہینہ کی پندرھویں رات میں غروب ہی کے وقت سے آسمان اول کی طرف نزول فرماتے ہیں جیسا نزول انکی شایان شان ہو اسمیں ہمکو کاوش کی ضرورت نہیں بلکہ اسکی ممانعت بھی ہے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہو پھر فرماتے ہیں کہ کوئی مغفرت کا طالب ہے ؟ کہ میں اُسکی مغفرت کردوں کوئی روزی کا طالب ہے کہ میں اُسکو روزی دوں کوئی بیمار (طالب شفا) ہے کہ میں اُسکو عافیت دوں اسی طرح بہت سے امور کے متعلق فرماتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے یہانتک کہ طلوع فجر تک یہی معاملہ رہتا ہے سبحان اللہ یہ اس رات کی کتنی بڑی فضیلت ہو گویا یوں کہنا چاہئے کہ اس رات حق تعالیٰ ہمارے گھر پر تشریف لاتے ہیں کیونکہ آسمان اول ہمارے گھر کی چھت ہے. اور محبوب کا چھت پر آجانا گھر ہی میں آجانا ہے تو بس ہمارا حال اس شعر کا مصداق ہوتا ہے ؎

امروز شاہ شاہاں مہمان شد است یارا
جبرئیل با ملائک دربان شد است یارا

اب اسکو خود سوچ لو کہ جب محبوب گھر میں مہمان ہو تو عاشق کا کیا حال ہوتا ہی جناب خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آتی یہی جی چاہا کرتا ہے کہ ساری رات محبوب سے باتیں کرتا رہوں خصوصاً جبکا محبوب ایسا ہو جو اپنے عشاق کی باتیں سننے سے گھبراتا بھی نہو نہ اسکو نیند آتی ہو نہ غنود گی ستاتی ہو ایسے محبوب کا عاشق تو ہرگز اُس رات میں نہ سو یگا جسمیں محبوب اسکے گھر پر آیا ہو بس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس رات میں قیام کا امر بھی نفرماتے جب بھی صرف اس خبر کا کہ حق تعالیٰ اس رات آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں مقتضا یہی تھا کہ ہم اس رات کو عبادت و ذکر میں گذاریں اور رات بھر بیدار رہیں چہ جائیکہ حضور کا بھی ارشاد ہے قوموا لیلہا وصوموا نہارھا ۔ مگر وہ شاہ شاہان ایسا مہربان ہے کہ مہمان ہو کر بھی تمھیں سونے سے نہیں روکتا تمکو سونیکی اجازت مگر باوجود اُس طرف سے اجازت ہونیکے پھر بھی یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جس روز

ویسے ہی اُس روز کچھ تو کرنا چاہیئے۔ رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے احب الاعمال الی اللہ ادومہا بہتر عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس پر دوام کیا جائے سو شعبان کی اس شب میں اتنا جاگنا چاہیئے جس پر نباہ ہو سکے یہ نہیں کہ ایک مرتبہ تو ساری رات جاگ لئے اور دوسری مرتبہ کچھ بھی نہیں شاید کوئی صاحب اس حدیث کو سنکر یہ کہیں کہ یہ دوام تو بڑا اسر لگا سال میں ایک رات تو کچھ دیر جاگنا آسان تھا سال بھر کون جاگے ارے صاحب؟ آپ گھبرائیں نہیں میں سال بھر کی راتوں میں آپ کو نہیں جگاتا بلکہ آپ سال میں ایک ہی رات جاگ لیا کیجئے رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں دوام کہاں ہوا تو میں کہتا ہوں یہ بھی ایک صورت دوام کی ہے کہ سال میں ایک رات ہمیشہ جاگ لیا کرے جیسے روٹی پر آپ کو دوام ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر وقت کھایا کرے یا کپڑے بدلنے پر دوام ہے کہ ہفتہ میں ایکبار یا دو بار بدلا کرتے ہیں اس دوام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر وقت کپڑے بدلے جائیں پس اسی طرح سال بھر میں ایک رات جاگنے کا التزام کر لینا یہ بھی دوام ہے بشرطیکہ یہ ایک رات ناغہ نہ ہو تو اس رات میں اتنی مقدار بیداری کیلئے معین کرنی چاہئے جس پر ہمیشہ کم از کم اس رات میں تو دوام ہو جایا کرے چاہے ایک ہی گھنٹہ ہو بلکہ میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ چاہے دو ہی رکعت ہوں کچھ تو ہوں بس قلیل عمل بھی دوام کیساتھ عمل کثیر بغیر دوام سے بہتر ہے اگر دو رکعت بھی کسی سے نہ ہو سکیں تو کم از کم ایک مرتبہ استغفار ہی اس رات میں پڑھ لیا کرے التزام کے ساتھ یہ بھی انشاء اللہ کافی ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہونچے وہاں — گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

سبحان اللہ یہ علوم ہیں حاجی صاحب کے۔ حق تعالیٰ نے حاجی صاحب کو کتنا سہل راستہ الہام فرمایا تھا بس وہی انبیاء کا راستہ ہے جسکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے جسکی شان یہ ہے محجۃ بیضاء نقیۃ لیلہا ونہارہا سواء حضرت حاجی صاحب کی بھی تعلیم تھی کہ کچھ کرنا چاہیئے چاہے قلیل ہی ہو بس تم ہر شعبان میں اس رات کیلئے کچھ کام مقرر کر لو یہ بھی دوام ہے اگر تمام رات بیدار نہ رہ سکو تو جتنا ہو سکے پانچ منٹ ہی سہی۔ اور حدیث میں آتا ہے اس رات سبکی مغفرت ہو جاتی ہے (جو بھی مغفرت طلب کرے ۱۲) سوائے مشرک اور مشاحن کے یعنی جن دو شخصوں میں دنیوی عداوت وکینہ ہو انکی بھی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ کہدیا جاتا ہے انکو ابھی رہنے دو جب تک آپس میں صلح کریں (قلت رواہ البیہقی من طریق العلاء بن

الحارث عن عائشۃ وقال ھذا مرسل جید یعنی ان العلاء لم یسمع من عائشۃ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم کذا فی الترغیب ص ۸۰ ج ۱) اللہ اللہ کینہ بھی کتنا گناہ ہے کہ اسکو شرک کیساتھ جمع کیا گیا ہے کہ جس طرح مشرک کی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی اسی طرح کینہ ور کی بھی مغفرت نہیں ہوتی اب تو مسلمانوں میں کینہ بہت ہی بڑھ گیا ہے حالانکہ اسمیں ہر مسلمان کا وہ مشرب ہونا چاہیے تھا جو صوفیہ کا ہے وہ تو یوں کہتے ہیں ۵ کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن ۰ آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن (کینہ کو کفر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب بکفر ہے اور اسکی دلیل حدیث مذکور میں موجود ہے کہ حضور نے مشاحن کو مشرک کیساتھ جمع فرمایا ۱۲) مگر اب تو صوفیوں میں بھی یہ بات نہیں رہی اُن میں کینہ و بغض کی کثرت ہونے لگی حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ دعا تعلیم کیگئی ہے ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا (اے اللہ ہمارے دلوں میں مسلمانوں کیطرف سے کینہ پیدا نہ کیجیے ۱۲) تو اس مرض سے بچنا چاہیے مگر آج کل مسلمان اپنے بھائیوں ہی سے کینہ بہت رکھتے ہیں غیروں سے تو اتحاد کی کوشش کیجاتی ہے انکو غیر قوموں سے اتنا کینہ نہیں ہوتا جتنا اپنے بھائیوں سے ہوتا ہے افسوس! پس اس رات سے پہلے ہر شخص کو اپنے دل میں سے مسلمانوں کیطرف سے کینہ نکال دینا چاہیے ورنہ اسکی مغفرت نہوگی اس وعظ کے ختم ہونے کے بعد (اوس دن چودھویں تاریخ تھی) جو رات اب آرہی ہے وہی لیلۃ النصف من شعبان ہے جس کا نام شب برات ہے مگر حلوے مانڈے والوں کے یہاں آج ہی شب برات ہے واقعی ان بدعات کیساتھ عقل بھی خبط ہو جاتی ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ دن کو شب کہتے ہیں شاید چودھویں تاریخ تو اہتمام کرنے سے پندرھویں رات ہی مقصود ہوتی ہوگی اسی اہتمام کے سبب چودھویں تاریخ ہی کو شب برات کہنے لگے۔ دوسری غلطی یہ کہ بقرعید کی طرح شب برات کا بھی عرفہ کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ تو عرفہ کو نہ جانتے ہوں گے مگر لکھنؤ وغیرہ میں آج سے ایک دن پہلے آفت شروع ہوگئی پھر وہ عرفہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اسمیں صرفہ بھی کیا جاتا ہے یہ سب قصہ پر جیون کا نکالا ہوا ہے انھوں نے اپنی کھانیکے واسطے ایک تو چودھویں ہی تاریخ سے شب برات شروع کردی پھر اُس کا ایک عرفہ نکالا تاکہ بار بار مٹھائی ملوا ملے۔ واللہ اگر ان کو مٹھائی وغیرہ نذر تو یہ خود بدعات سے توبہ کرلیں اُن کا آسان امتحان یہ ہے کہ ان سے فاتحہ خوب دلواؤ مولود خوب پڑھواؤ اور کچھ دو دلاؤ نہیں پھر دیکھو جب اُنکو مفت کی مشقت پڑیگی وہ خود ان کو بدعات کہنے لگیں گے۔ کانپور میں ایک مولوی صاحب

کسی رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے درمیان میں آپنے ایک شعر پڑھا اور وجد ظاہر کرکے اپنا کرتہ جھٹ سے پھاڑ ڈالا یہ معاملہ دیکھکر گھر والے نے اُسی وقت بزاز کے یہاں سے اُس بدذات کے واسطے کپڑا منگایا (کیونکہ اسمیں اُنکی سبکی تھی کہ مولوی صاحب ان کے گھر آئے تھے سر ننگے اور جائیں ننگے ۱۲) تو یہ لوگ دنیا وصول کرنیکے لئے ایسی ایسی ترکیبیں کرتے ہیں اگر ان کو کچھ ندیا جاوے اُسوقت سب بدعات کی حقیقت خود ہی کھُل جاوے ۔ لوگ خواہ مخواہ دلائل سے اُن کو طے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حق و ناحق کا امتحان اس ترکیب سے باآسانی ہو سکتا ہے مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی گو معقولی تھے مگر خوش عقیدہ تھے اُن سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مولود پڑھنا کیسا ہے ۔ فرمایا بڑی برکت کی چیز ہے اسکی ادنیٰ برکت تو یہ ہے کہ مولود خواں کو کم از کم دو حصے تو ضرور ہی ملتے ہیں اسی طرح ایکمرتبہ ایک خان صاحب مولانا کے پاس آئے تھے وہ اس زمانہ میں مستاجری کرتے تھے جس کا بھوپال وغیرہ میں بہت رواج ہے تو مولانا نے خان صاحب سے پوچھا کہ آج کل تو وصولیابی کے دن ہیں آپ یہاں کیسے آگئے خان صاحب بولے کہ میں تو گانوں کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں مولانا نے فرمایا اچھا ہم تو ابتک یہ سمجھتے تھے کہ بڑے پیر صاحب ولی ہیں مگر آپکے قول سے معلوم ہوا کہ بدرہان بھی ہیں جو زمین و جائداد کا بھی انتظام کر لیتے ہیں غرض ان بدعات کا کچھ خاصہ ہے کہ ان سے عقل بھی خبط ہو جاتی ہے اور منشا سب کا وہی پیٹ کا دھندا ہے یہ پیٹ انسان سے سب کچھ کراتا ہے ۔ چنانچہ بدعاتِ شعبان میں بھی انہی حضرت کی برکت کا ظہور ہوتا ہے مسلمان کیلئے اتنی بات کافی ہے کہ جو کام کرے یہ دیکھ لے کہ حضور نے بھی اسکو کیا ہے یا نہیں یا اشارۃً دلالۃً اسکی ترغیب یا اجازت دی ہے یا نہیں چنانچہ شعبان کی اس رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا حلوا وغیرہ کچھ نہیں پکوایا جب حضور نے یہ کام نہیں کیا تو تم کیوں کرتے ہو شیخ سعدی رح نے خوب فرمایا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا — و لیکن میفزائے بر مصطفیٰ

(یعنی زہد و ورع و صدق و صفا میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ حضور سے کوئی بڑھ نہیں سکتا بلکہ جو حضور سے بڑھتا

۱؎ لفظ جامع کا یہ بطور روایت نقل ہے ۱۲

چاہتا ہے وہ اور نیچے کو گر جاتا ہے ۱۲ جامع) بھلا ان بدعات میں تو بعض منکرات ایسے مختلط ہیں جنکی وجہ سے ان کو مباح بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر کوئی کام منکرات سے خالی بھی ہو اور فی نفسہ مباح ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسکو اختیار نکیا ہو تو عارفین اسکو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ان ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں جو حضور سے عملاً ثابت ہیں چنانچہ مولانا گنگوہی (قدس سرہ) فرماتے تھے کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ایکبار فرمایا کہ بھائی بزرگوں نے تو ہر لقمہ اور ہر گھونٹ پر الحمد للہ کہنے کی ترغیب دی ہے اور یہی اُن کا معمول بھی ہے مگر ہمکو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے محبت ہے کہ بس ایک بار شروع کھانے میں بسم اللہ کہلے اور ایک بار فراغت کے بعد الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین ۱۲) کہلیا مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حافظ صاحب نے یہ کیا اچھی بات فرمائی اھ اتباع سنت اس کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے تو محض نام ہی یاد کر لیا ہے بس اتباع سنت اسی میں ہے کہ اس زمانہ کے متعلق جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہی کیا جائے اور اپنی طرف سے کچھ زیادتی نہ ایجاد کی جائے شعبان کے مہینہ میں حضور سے ایک تو یہ ثابت ہے کہ پندرھویں رات کو کچھ اور راتوں سے زیادہ بیدار رہا جائے دوسرے یہ ثابت ہے کہ پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا جائے اس روزہ کا بہت ثواب ہے اور حکمت اس دن کے روزہ کی اور اسکی رات کے قیام کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نصف شعبان کا وقت مقدار و کیفیت وغیرہ میں رمضان کے وقت کے مماثل ہوتا ہے چنانچہ اس کے بعد رمضان تک دن کی زیادتی کمی میں نمایاں فرق نہیں ہوتا چند منٹوں ہی کا تفاوت ہوتا ہے نیز موسم میں بھی کچھ زیادہ تغیر نہیں ہو سکتا پندرہ دن میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں ہوا کرتا جیسی گرمی ۱۵ شعبان کو ہوگی بس قریب قریب اسی کے یکم رمضان کو ہوگی تو اس دن کے روزہ کی اور اسکی رات کے قیام کی ترغیب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس دن کا روزہ رکھکر اور اسکی رات کو جاگ کر امتحان کر لو کہ بس رمضان کا روزہ بھی ایسا ہی ہوگا اور تراویح کی نماز بھی ایسی ہی ہوگی جیسے اس رات کا جاگنا پھر گھبراتے کیوں ہو میں اس حکمت کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے اور گو

یہ حکمت مقصود نہو مگر اس دن کے صیام اور رات کے قیام پر یہ فائدہ مرتب تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سے رمضان کے صیام و قیام کا نمونہ معلوم ہو کر اسکی ہمت بندھ جاتی ہے۔ اور مجھے یہی حکمت معلوم ہوتی ہے حدیث اذا انتصف شعبان فلا صوم الا عن رمضان کی (جب شعبان نصف گذر جائے "اور گذر جانیکے ترجمہ سے خود پندرھویں تاریخ کا اس سے خارج ہونا مفہوم ہو گیا کیونکہ نصف متیقن پندرھویں کے بعد ہی گذرتا ہے نہ اس سے پہلے" تو رمضان کے سوا اور روزہ نہیں) کہ اس سے بھی رمضان کیلئے ہمت کا تازہ رکھنا مقصود ہے اگر نصف شعبان کے بعد روزے رکھے گئے تو ان سے لحوق ضعف کا اندیشہ ہے جس سے شاید رمضان کے روزوں کی ہمت پست ہو جائے۔ اور اگر نصف شعبان کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہے گی تو وہ ہمت جو ایک روزہ کے امتحان سے پیدا ہو چکی تھی کمزور نہو گی باقی احکام شرعیہ کی مصالح کا احاطہ کون کر سکتا ہے یہ بھی حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ کچھ تھوڑی بہت حکمتیں ہم جیسوں کو بھی بتلادی جاتی ہیں جن سے ضعیف الایمان لوگوں کو تسلی ہو جاتی ہے ورنہ مسلمان کا اصل مذاق تو یہ ہونا چاہئے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

اب میں ایک مضمون اور بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی پر بیان کو ختم کردونگا کیونکہ وقت بہت گذر گیا عصر کی نماز بھی قریب ہے یہ مضمون پہلے ایک علمی رسم سے ظاہر ہو چکا ہے اور اسکی اجمالی کیفیت ایک مختصر تقریر سے معلوم ہو چکی ہے میں مضمون کو بھی اسی آیت میں داخل کرتا ہوں یہ مضمون **دستار بندی علما** ہے گو اس میں ہم لوگوں کی اغراض مختلف ہو گئی ہیں جنمیں بعض اغراض خراب بھی ہیں کہیں اس سے اپنی کارگذاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہیں چندہ کی کوشش کیلئے اس قسم کے جلسوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور چندوں میں حدود شرعیہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہیں اسکی حقیقت اور اس فعل کے درجہ کو واضح نہیں کیا جاتا جس سے عوام کو غلطی اور خود فارغ شدہ جماعت کو بھی دھوکہ ہوتا ہے لوگ ان لوگوں کو ابھی سے مقتدا اور معتمد سمجھنے لگتے ہیں اور خود فارغ شدہ جماعت بھی اپنے متعلق یہ اعتقاد کر لیتی ہے کہ بس ہم آج سے مقتدا ہو گئے باقی اصل مقصود اس تقریب

تعلیم علم کا اہتمام اور غیر فارغ شدہ جماعت کو تکمیل کی رغبت دلانا ہے اور حقیقت اسکی وہ ہے جسکو میں عنقریب بیان کرونگا - رہا یہ کہ ہماری غرض اسوقت اس تقریب سے کیا تھی سو یہ بات گو مجھے اپنے آپ نہ بیان کرنی چاہیئے تھا مگر خدا کی نعمت سمجھکر بیان کرتا ہوں کہ بحمد اللہ یہاں اس تقریب سے نہ مدرسہ کی شہرت مقصود ہے اور اس مختصر جلسہ سے جسکے لئے کوئی تداعی واہتمام مطلق نہیں کیا گیا اس کا وہم ہی کیا ہو سکتا ہے نہ مدرسہ کی کارگذاری کا اظہار مقصود ہے اور یہ کارگذاری ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ساری عمر میں مدرسہ سے ایک طالبعلم کی تکمیل ہوئی نہ اس سے کچھ چندہ کی کوشش مقصود ہے کیونکہ یہ دفتر ہی یہاں بند ہے نہ یہاں اسکی سعی ہے نہ مدرسہ سے چندہ کی فہرست اور حساب کی روداد شائع ہوتی ہے محض توکل پر کام چل رہا ہے نہ اس تقریب سے عوام پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ان فارغ شدہ طالبعلم کو آج ہی سے مقتدا اور عالم فاضل سمجھنے لگیں بلکہ محض یہ بتلانا ہے کہ ان صاحب نے ہمارے مدرسہ میں درسیات کی تکمیل کرلی ہے اور ہمارے نزدیک ان میں استعداد اور مناسبت علوم سے پیدا ہو گئی ہے جسکی شہادت مدرسین مدرسہ نے سند دیکر ظاہر کی ہے باقی محض استعداد ومناسبت سے مقتدائیت اور فضل وکمال پیدا نہیں ہوجاتا بلکہ اسکے لئے شغل درس تدریس اور کتب دینیہ کا مطالعہ کرتے رہنا ضروری ہے (اور یہی مطلب ہے مدرسین کا سند دینے سے کہ ہمارے نزدیک ان میں استعداد مقتدائیت موجود ہے اگر یہ اس استعداد سے کام لیتے رہیں گے تو انشاء اللہ ایک دن مقتدا اور معتمد عالم ہوجائیں گے ۱۲) اور دوسری غرض اس تقریب سے وہ ہے جو آیت متلوہ پر اس مضمون کے انطباق سے ظاہر ہوگی اس آیت کے اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ذالکم وصّکم بہ لعلکم تتقون میں اس مضمون کو ذٰلکم وصّکم بہ میں داخل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جسطرح اس جملہ میں حق تعالیٰ نے صراط مستقیم کے اتباع کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح دستار بندی اور اعطار سند بھی وصیت عملی ہے جس سے مقصود فارغ شدہ طالب علم کو اتباع صراط مستقیم کی وصیت مقصود ہے اور اُن کو بتلانا ہے کہ تم ہمارے نزدیک حامل شریعت ہوا در مقتدا بننے کی تم میں استعداد پیدا ہوگئی ہے اب ہم تمھاری اس قابلیت کو عملاً ظاہر کرتے ہیں کیونکہ عادۃً احیار طبائع کو اس عملی صورت

کی آج بہت ہوا کرتی ہے جس سے وہ اپنے اوپر ایک بارِ گراں محسوس کرتے ہیں نیز عوام کو بھی اس صورت سے یہ وصیت مقصود ہے کہ یہ فارغ شدہ طالب علم اب عالم ہوگئے ہیں ان کا ادب کرنا چاہئے اور ان سے مستفیض ہونا چاہئے (بشرطیکہ یہ اسی شغل میں لگے رہیں) پس جس طرح کہ آیت میں اصل مقصود تاکیدی حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا جسکو مجازاً وصیت سے تعبیر کیا گیا اسی طرح یہاں اس عملی صورت (دستار بندی وغیرہ) سے اصل مقصود تاکیدی حکم ہے ان صاحب کو جنکی دستار بندی کیگئی ہے جس کو مجازاً میں وصیت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب اس مضمون کا تعلق آیت کے اس جزو سے واضح ہوگیا ہوگا۔ نیز انطباق کی ایک تقریر یہ ہوسکتی ہے کہ جن اعمال کی یہاں وصیت ہے ان پر عمل کرنا موقوف ہے علم پر تو عمل کی تاکید مستلزم ہے تحصیل علم کی تاکید کو تو تحصیل علم کو موجب اسعاد سمجھکر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھکر ترک کرے۔ اور تیسرے مضمون کے اعتبار سے میں اس بیان کے نام میں ایک اضافہ کرکے الاسعاد والابعاد مع مجلس قباد رکھتا ہوں گو نام لمبا ہوگیا مگر مولوی قباد کے دوست اتنی مشقت برداشت کرلیا کریں گے۔ لمبے نام پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کی کنیت ابوعبداللہ تھی کسی نے اس سے پوچھا کہ تیری کنیت کیا ہے تو صرف ابوعبداللہ کہتے ہوئے اسے شرم آئی کہ یہ تو ذرا سا نام ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے ابوعبداللہ السمیع العلیم الذی یمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ اسپر ایک ظریف نے کہا مرحبا بک یا ابا نصف القرآن واقعی خوب ہی ظرافت کا جواب دیا تو ایسے ہی اس وعظ کا نام بھی لمبا ہوگیا اتنا فرق ہے کہ وہاں طول بے ضرورت تھا اور یہاں بضرورت ہے۔ اب یہاں آیت کے متعلق ایک نکتہ ہے اسکو بیان کرکے میں ختم کئے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم سے وان ھذا صراطی مستقیما تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالیٰ نے ذلکم وصکم بہ فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو ذلکم وصکم بہ لعلکم تعقلون فرمایا اور دوسری

آیت کے ختم پر ذلکم وصکم بہ لعلکم تذکرون فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں ذالکم وصکم بہ لعلکم تتقون فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سبکی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان کی کیا ضرورت ہے گو اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ مقصود تفنن کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چلبلے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ اُن کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انھوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے اُن میں بجز اسارۃ بالوالدین کے اہل عرب اعتقادی غلطی کرتے تھے کہ امور قبیحہ کو مستحسن سمجھتے تھے صرف اسارۃ بالوالدین (یعنی ماں باپ کے ساتھ بُرا سلوک کرنے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں اُن کی اعتقادی غلطی تھی اسلئے باعتبار اکثر کے وہاں تعقلون فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جنمیں وہ تغافل وسہو کرتے تھے اسلئے وہاں تذکرون مناسب ہوا۔ اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں تتقون مناسب ہوا کیونکہ تقوٰی بھی شرعاً عام ہے جس کا تعلق عقائد واعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے۔ تو بعض عقلاء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے اگر کسی کو پسند ہو تو اس کو اختیار کرے ورنہ اسکی کوئی ضرورت ہے نہیں اور بظاہر یہ نکتہ بعید بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو لطائف تھے مگر اصل مقصود میرا وہی مراقبہ ہے کہ ہر کام اور ہر حرکت وسکون میں یہ سوچا جائے کہ یہ فعل آخرت کیلئے معین ہے یا مضر اگر معین ہو تو اُسکو کیا جائے اگر مضر ہو نکیا جائے اس طرح انشاء اللہ بہت جلد معاصی سے اجتناب کی ہمت پیدا ہو جائیگی اور جو اس سہل ترکیب سے بھی کام نہ لے تو وہ اپنے ہاتھوں محروم ہونا چاہتا ہے اسکا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمکو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق دیں اور ان فارغ شدہ طالب علم کیلئے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ انکو صراط مستقیم پر چلائے اور ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں آمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ

واصحابہ اجمعین ۰

دو سرا مژدہ

حق تعالیٰ کا لاکھہ لاکھہ شکر ہے کہ وہ تمنا جو ۱۳۲۲ھ سے دلمیں اور اسکی تکمیل کے لئے دل بے اختیار تھا سنہ ۱۳۴۱ھ میں پوری ہوئی کہ کتاب مستطاب مسمی بہ "کلام الملوک" جو کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نظم ملفوظات کا مجموعہ ہونے کے اعتبار سے ملوک الکلام ہے طبع ہوکر اہلِ علم کیخدمت میں پیش ہوگئی، یہ مجموعہ بفضلہ تعالیٰ جسطرح کلام صحابہ ہونے کی وجہ سے بیشما انوار و برکات پر مشتمل ہے اسی طرح ایک ممتاز درجہ کی ادبی کتاب بھی ہے۔ اور چونکہ ہر کلام کے اول میں مختصراً اسکا موقعہ بھی لکھا گیا ہے اس لئے ایک مختصر تاریخی کتاب بھی ہے اور مضامین کی خصوصیات کے جو فوائد ہیں، مثل مدح نبوی اور مدح صحابہ اور ان کے کارنامے، اور انکی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت وغیرہ اُن کے علاوہ ہے عام شائقین کے نفع کے لئے ان اشعار کا اردو سلیس ترجمہ بھی حاشیہ پر لکھدیا گیا ہے تاکہ اردو خواں حضرات بھی ان برکات سے منتفع ہوسکیں،

مفید مشورہ

اس خزینہ طیبہ کو اگر حضرات اہلِ علم خصوص مہتممین اپنے مدارس میں داخل درس فرما دیں تو اسکا نفع تام ہوجاوے اور تاجر اگر اسکی قیمت میں رعایت کا لحاظ رکھیں تو انشاء اللہ نفع عام ہوجاوے۔ اس مجموعہ مبارکہ کا ہدیہ تین روپیہ آٹھ آنہ ہے اور مدرسین و طلبہ کیلئے حسب مشورہ حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم برعایت خاص (۱۲؍) علاوہ محصولڈاک ہے محصولڈاک بر ذمہ

المشتہر

(صوفی) عبد القادر ناظم امداد المواعظ مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر